

الفاضل المتوكل الكامل المتوحد جامع العلوم العقلية والنقلية واقف الرموز والحكم من ايام الهمام
شيخ العلماء الاعلام بلجا حكما العالم مرجع افاضل العرب والعجم زبدة السالكين عمدة العارفين

سوانح عمری

الحکیم
آفتاب پنجاب
حضرت علامہ
رحمۃ اللہ علیہ
مع مشاہیر تاریخ سیالکوٹ

مصنف محمد الین فوق

ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس

انتظامیہ جامعہ مسجد علامہ عبدالحکیم

تخصیص بازار سیالکوٹ



افضل المتوكذ الكامل المتوحد جامع العلوم العقائديه والتنظييه واقف الرموز الحكيم من امام الحكماء
شيخ العلماء الاعلام بلجاء العالم مرجع افاضل العرب والعجم زبدة السالكين عمدة العارفين

سورة عمى

الحكمة
آفتاب پنجاب
حضرت علامہ
محمد شفیع

مع شاہ میرزا بیچ سیالکوٹ

صنف محمد اللہ بن فوق

ڈاکٹر محمد یونس بھٹا

انتظامیہ جامعہ اسلامیہ علامہ عبدالحکیم

تحصیل بازار سیالکوٹ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

.....	نام کتاب
سوانح حیات علامہ عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ فاضل سیالکوٹی	
مع تاریخ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ	
.....	مصنف
محمد الدین فوق، ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس	
.....	اشاعت اول
۱۹۲۲ء	
.....	اشاعت دوم
مارچ ۱۹۷۳ء	
.....	اشاعت سوئم مع تکملہ
فروری ۲۰۰۹ء	
.....	ناشر
انتظامیہ جامع مسجد علامہ عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ	
تخصیل بازار سیالکوٹ	
.....	ہدیہ
برائے ایصال ثواب	

فہرست سوانحیات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
7	قارئین!	☆
12	پیش گفتار	☆
15	مولانا عبدالحکیم (مقدمہ از ڈاکٹر محمد اقبال)	(۱)
15	دیباچہ از مصنف	(۲)
21	وطن، خاندان، پیدائش	(۳)
24	فاضل سیالکوٹی کا استاد	(۴)
29	علامہ عبدالحکیم کے ہم مکتب	(۵)
34	مولانا عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی	(۶)
39	مولوی عبدالحکیم عہد اکبری میں	(۷)
40	مولوی عبدالحکیم عہد جہانگیری میں	(۸)
42	مولوی عبدالحکیم اور شہنشاہ شاہجہان	(۹)
49	مولوی عبدالحکیم کے تلامذہ	(۱۰)
53	مولوی عبدالحکیم اور شیخ آدم بنوری	(۱۱)
55	مولوی عبدالحکیم اور حافظ شیخ حسین	(۱۲)
56	مولوی عبدالحکیم کا کتب خانہ	(۱۳)
56	علامہ عبدالحکیم کی وفات اور ان کا مقبرہ	(۱۴)
60	مولوی عبدالحکیم کی اولاد و احفاد	(۱۵)

64	مولوی عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عمارتیں	(۱۶)
70	مولوی عبدالحکیم اور علماء و مشائخ اور مؤرخین	(۱۷)
72	مولوی عبدالحکیم کی تصنیفات	(۱۸)
75	مولانا عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف	(۱۹)
77	نظم در فضائل علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی	(۲۰)
78	حاجی محمد سعید اور علامہ عبدالحکیم	(۲۱)
79	شیخ سعدی کی گلستان اور علامہ عبدالحکیم	(۲۲)
80	تبصرہ	(۲۳)
101	تکلمہ	(۲۴)
106	تلاذہ	(۲۵)
☆☆☆		
فہرست مشاہیر سیالکوٹ		
134	میاں وارث کاشمیری	(۱)
134	حضرت شاہ حمزہ غوث	(۲)
135	بابا فتح اللہ حقانی	(۳)
136	بابا عمر حقانی کاشمیری	(۴)
136	اخوند مولانا جمال	(۵)
137	آخوند ملا کمال	(۶)
137	مولانا محمد رضا	(۷)

138	حاجی فتح محمد	(۸)
138	حاجی لال بیگ	(۹)
138	حاجی عبدالغنی	(۱۰)
138	حاجی مقصود	(۱۱)
139	شیخ رنگا وڈہرہ	(۱۲)
139	شاہ سیدا	(۱۳)
139	حضرت شاہ دولہ گجراتی	(۱۴)
140	قاضی محمد عارف	(۱۵)
140	ملا عیسیٰ	(۱۶)
140	ملا محمد سیالکوٹی	(۱۷)
141	اخون میر محسن سیالکوٹی	(۱۸)
142	حافظ نور محمد سیالکوٹی	(۱۹)
143	شیخ محمد سیالکوٹی	(۲۰)
144	مولوی شیخ اصغر علی	(۲۱)
☆☆☆		
مختصر تاریخ سیالکوٹ		
154	سیالکوٹ کی تواریخیں	(۱)
154	سیالکوٹ کی وجہ تسمیہ	(۲)
155	خاندان غزنوی و غوری کا تعلق سیالکوٹ سے	(۳)

157	سیالکوٹ شاہان تغلق کے عہد میں	(۴)
158	قلعہ سیالکوٹ کی دیواروں پر ایک مسلمان کے خون کا چھڑکاؤ	(۵)
163	سیالکوٹ اور سلطان حسن شاہ	(۶)
164	سیالکوٹ عہد بابر میں	(۷)
166	سلیم شاہ سوری سیالکوٹ میں	(۸)
167	سیالکوٹ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں	(۹)
169	سیالکوٹ عہد جہانگیری میں	(۱۰)
170	سیالکوٹ شاہ جہاں کے زمانہ میں	(۱۱)
172	سیالکوٹ عالمگیری عہد میں	(۱۲)
175	بہادر شاہ عالم اور سیالکوٹ	(۱۳)
175	فرخ سیر کا عہد اور سیالکوٹ	(۱۴)
176	حقیقت رائے کا مشہور واقعہ	(۱۵)
178	محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ اور سیالکوٹ	(۱۶)
179	احمد شاہ اور سیالکوٹ	(۱۷)
179	احمد شاہ کابلی کے ماتحت سیالکوٹ کی حالت	(۱۸)
182	رنجیت سنگھ کی فوج کشی سیالکوٹ پر	(۱۹)
185	شاہ شجاع والے کابل سیالکوٹ میں	(۲۰)
186	سیالکوٹ شہزادہ کشمیر سنگھ و پشوار سنگھ کی جاگیریں	(۲۱)
188	غدر ۱۸۵ء کا سیالکوٹ	(۲۲)



برائے ایصالِ ثواب

شیخ الحدیث والتفسیر محدث سیالکوٹی

حضرت علامہ مولانا پیر

حافظ محمد عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

پیر طریقت رہبر شریعت جگر گوشہ فقیہ اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سلطان الواعظین حضرت علامہ

ابوالنور محمد بشیر احمد کوٹلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

برائے ایصالِ ثواب

مناظر اسلام مصنف کتب کثیرہ

حضرت علامہ مولانا ابوالحامد محمد ضیاء اللہ قادری

اشرفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

عاشق رسول مخدوم اہل سنت

خواجہ محمد ہدایت اللہ بیٹ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

خواجہ محمد جمیل صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد انور صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

برائے ایصالِ ثواب

شہر سیالکوٹ کی معروف سماجی شخصیت

الحاج سید محمد بشیر صاحب و اہلیہ محترمہ

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما

بانی سردار بیگم ہسپتال سیالکوٹ

والدین محترم حاجی غلام مرتضیٰ صاحب

قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

علامہ عبدالحکیم فاضل سیالکوٹی قدس سرہ العزیز جن کی سوانح حیات پیش خدمت ہے۔ اپنے دور کی بے مثال ہستی ہیں۔ علم و عمل اور زہد و ورع میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ اہالیان سیالکوٹ پر آپ کا احسانِ عظیم ہے۔ لیکن آپ کی علمی خدمات سے اہالیان سیالکوٹ کی اکثریت ناواقف ہے۔

کمیٹی جامع مسجد علامہ عبدالحکیم علیہ الرحمۃ (رجسٹرڈ) تحصیل بازار سیالکوٹ ہر سال آپ کے سالانہ عرس مبارک کا اہتمام کرتی ہے۔ اس سال فقیر کو اپنے تئیں احساس ہوا کہ کتابی شکل میں فاضل سیالکوٹی کی سوانح حیات شائع کر کے اہالیان سیالکوٹ کو علامہ موصوف کی گراں قدر خدمات اور آپ کے علمی مقام سے روشناس کرایا جائے۔ اور مسجد کمیٹی کی توجہ کو بھی اس طرف مبذول کرایا جس کا انہوں نے بھی اقرار کیا۔ اور اس عرس مبارک پر جو کہ ۲۰ فروری ۲۰۰۹ء کو منعقد ہو رہا ہے۔ کتابی شکل میں سوانح حیات شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور پروگرام کے مطابق علامہ عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات جو کہ ۱۹۲۳ء میں محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور نے مرتب کی تھی اس پر ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس صاحب نے مزید اضافہ کر کے آپ کی تصانیف کا تعارف اور آپ کے تلامذہ کا ذکر خیر بھی شامل کیا۔ ان دونوں احباب کی اس کاوش کو کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ سیالکوٹ اور مشاہیر سیالکوٹ کا تذکرہ جو کہ محمد الدین فوق صاحب نے کیا ہے وہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین! وہ پروگرام عملی شکل میں آپ کے

سامنے ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے جملہ اخراجات صاحب زادہ محمد حامد ضیاء قادری رضوی اور ان کے ساتھ خواجہ عمران سہیل بٹ صاحب، مولانا محمد خالد رضوی صاحب، خواجہ محمد طاہر صاحب، حاجی محمد غلام مرتضیٰ صاحب، محمد محسن صاحب، محمد شفیق رضوی صاحب نے برداشت کیے اللہ کریم بجاہ النبی ﷺ قبول فرمائے اور ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

اس کے بعد اپنے استاد محترم مولانا عبداللطیف نقشبندی صاحب، مولانا عبدالخالق بجواتی صاحب، صاحبزادہ حافظ محمد غلام محی الدین صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ جنہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے میری رہنمائی فرمائی۔ اور اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

خادم علماء

صاحبزادہ محمد حامد ضیاء قادری رضوی

خطیب: جامع مسجد علامہ عبدالحکیم علیہ الرحمہ

تخصیل بازار سیالکوٹ

۱۰ فروری ۲۰۰۹ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش گفتار

زیر نظر کتاب دراصل تین رسائل کا مجموعہ ہے جسے محمد الدین فوق نے

ترتیب دیا ہے۔

(۱) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی سوانح عمری

(۲) مشاہیر سیالکوٹ

(۳) تاریخ سیالکوٹ

یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مقدمہ لکھا۔ عرصہ یہ کتاب نایاب تھی۔ مولانا ضیاء اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے جناب مولانا حامد ضیاء قادری رضوی نے تگ و دو کی کہ یہ کتاب دوبارہ عصری اسلوب کے مطابق شائع کی جائے راقم نے اس کتاب پر درج ذیل اضافے کئے۔

(۱) تینوں رسائل کی فہرست مرتب کیں۔

(۲) حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور تلامذہ سے متعلق بعض اضافہ جات کئے۔

(۳) حیات و خدمات سیالکوٹی کے ماخذ کی ایک فہرست مرتب کی تاکہ محققین کے

لئے آسانی ہو سکے۔ جن دو بنیادی کتب سے میں نے یہ مواد اکٹھا کیا ان کا

حوالہ اپنے مقام پر دیا ہے۔

اس کتاب پر عجلت میں یہ مختصر اضافہ جات کئے اس کا قوی محرک یہ تھا کہ حضرت سیالکوٹی کو امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خاص نسبت و محبت تھی۔ اسی نسبت کا تقاضا تھا کہ راقم اس کتاب کی کچھ خدمت کرتا۔ اس خدمت کو اللہ کریم اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

طالب دعاء

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

شعبہ اسلامیات

جی سی یونیورسٹی لاہور

۳۰ اکتوبر ۲۰۰۸ء



یہ ہدیہ ناچیز

کہ نام اس کا

”سوانحیات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی“

ہے

باجازت خاص

فاضل اجل عالم بے بدل عالی جناب

حضرت حافظ حاجی مولانا پیر

سید جماعت علی شاہ صاحب

محدث دام فیوضہ

علیپور سیداں ضلع سیالکوٹ

کے بابرکت نام پر نہایت ادب و خلوص کیساتھ معنون کیا جاتا ہے

خاکپائے اہل ذوق

محمد الدین فوق

”مولانا عبدالحکیم“

از: ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے (سیالکوٹی) پی۔ ایچ۔ ڈی)

پیرسٹریٹ لا۔ لاہور

مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ جو شاہان مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہجہان تک پہنچی۔ جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دربار دہلی میں بادشاہ کے اشارہ سے بڑے بڑے معرکۃ الداء مذہبی و فلسفیانہ مباحث ہوا کرتے تھے۔ جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکماء کو مجو حیرت کیا کرتی تھیں۔

ان کی فلسفیانہ تصانیف میں ”سیلکوٹی علی التصورات“ ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں۔ جو اسلامی ممالک میں بہت مقبول اور ہر دل عزیز ہیں۔ توحید باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک خاص رسالہ جو شاہجہان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا میری نظر سے گزرا ہے۔ مگر غالباً آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ اب تقویم پارینہ ہے۔ لیکن اسلامی فلسفہ کا مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقعہ ہے نہایت کس مپرسی کی حالت میں اہل سیالکوٹ کی بے حسی اور مردہ دلی کا گلہ گزار ہے۔“

غشی محمد الدین صاحب فوق نے جن کی تاریخی کرید مشہور ہے مولانا مرحوم کے حالات زندگی لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

اس رسالہ میں ضمناً سیالکوٹ شہر کے تاریخی حالات بھی ہیں۔ جو نہایت تجسس اور تلاش سے فراہم کئے گئے ہیں اہل سیالکوٹ کو ان حالات سے بالخصوص دلچسپی ہوگی۔

۳۳ دسمبر ۱۹۲۲ء

محمد اقبال



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

میرا ایک عرصہ سے ارادہ تھا۔ کہ میں اس فاضل اجل۔ یگانہ روزگار بزرگ کے حالات قلمبند کروں۔ مگر اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (گورنمنٹ نے آپ کی اعلیٰ علمی قابلیت کی وجہ سے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو آپ کو نائیٹ ہڈ (سر) کا خطاب دیا ہے۔) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی بیرسٹریٹ لاء لاہور سے کہ وہ بھی اپنے کمال علم و فضل کی وجہ سے سیالکوٹ کے فخر، پنجاب کے مایہ ناز۔ اور ہندوستان کے آفتاب ہیں۔ ذکر آیا بجھے ہوئے جوش اور مٹے ہوئے ارادہ میں پھر حرکت اور تازگی پیدا ہو گئی۔

۱۹۱۹ء کی گرمیوں کے ایام تھے کہ ارادہ عمل کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ اور چونکہ مولانا کے حالات میں کوئی مستقل کتاب اب تک نہ لکھی گئی تھی۔ اس لیے سوانحات عمر کی تلاش و ترتیب کے لیے بڑی مشکلات پیش آئیں اس سے بھی زیادہ مشکل کام مولانا کی تصنیفات پر جو سب عربی زبان میں ہیں تبصرہ اور تنقید تھا لیکن جب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تحریک سے مولانا محمود علی صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر رندھیر کالج کپور تھلہ نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ تو مجھے بہت بڑا سہارا مل گیا۔ اور میں نے چار ماہ کی محنت اور جستجو کے بعد اس کتاب کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں ترتیب دے دیا۔

(۱) سوانحات عمر علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

(۲) تاریخ سیالکوٹ

(۳) مشاہیر سیالکوٹ

۱۹۲۰ء کے ایام سرما میں جب حضرت حافظ حاجی سید جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری لاہور تشریف لائے تو میں نے اس کتاب کا ذکر کیا۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور ارشاد کیا کہ مسودہ کا کچھ حصہ ہم کو سنایا جائے دوسرے دن میں نے کہیں کہیں سے کچھ عرض کیا۔ آپ نے مسرت و خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے میری حوصلہ فزائی فرمائی۔ اور میری گزارش پر اس کتاب کو اپنے مبارک نام پر معنون کرنا پسند فرمایا۔ بلکہ ارشاد فرمایا۔ کہ ہمارے لیے یہ بات قابل عزت ہے اور قابل فخر ہے کہ کتاب ”سوانحات عمر علامہ عبدالحکیم“ ہمارے نام پر شائع ہو۔

میں نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے اپنی مختصر سی لائبریری کی چھان بین کی۔ تو مندرجہ ذیل کتابوں میں (جن تذکروں اور تاریخوں میں سے میں نے اس کتاب کے باقی دو حصوں تاریخ سیالکوٹ اور مشاہیر سیالکوٹ کی ترتیب میں مدد لی ہے اور ان کتابوں کے علاوہ ہیں۔) ”فاضل سیالکوٹی اور ”فاضل لاہوری“ کے متعلق کہ آپ اس نام سے بھی مشہور تھے۔ کہیں کہیں چند سطور نظر سے گذریں:

نمبر شمار	نام مصنف	سنہ تصنیف	نام کتاب
۱	غشی امین چندا کشر اسٹنٹ کشنر سیالکوٹ	۱۸۶۷ء	تاریخ بندوبست سیالکوٹ
۲	خواجہ عبدالصمد سیالکوٹی	۱۳۰۲ھ	تاریخ سیالکوٹ
۳	مولانا محمد سعید مارہروی	۱۳۲۳ھ	آثار خیر

۴	مولوی محمد الدین مولوی فاضل لاہوری	۱۸۷۹ء	روضۃ الادبا
۵	لالہ رام جس۔ سی۔ آئی۔ ای مدارالمہام ریاست کپورتھلہ	۱۸۹۷ء	تاریخ ریاست کپورتھلہ
۶	مولانا محمد الہاشم مرید حضرت مجدد الف ثانیؒ	اصل فارسی ۱۰۳۷ھ	ترجمہ زبدۃ المقامات
		ترجمہ ۱۳۲۰ھ	
۷	مولوی خادم علی سندیلوی	۱۲۶۹ھ ۱۸۸۳ء	تاریخ جدولیہ
۸	مولوی فقیر محمد چہلمی	۱۳۱۰ھ	حدائق الخفیہ
۹	مولوی مرزا عبدالستار بیگ سہرامی	۱۳۲۸ھ	مسالك السالکین جلد اول
۱۰	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	تصنیف ۱۱۶۶ھ طبع ۱۹۱۰ء	مآثر الکرام فارسی
۱۱	صمصام الدولہ شاہ نواز خاں	بعہد محمد شاہ	مآثر الامراء
۱۲	داراشکوہ بن شاہجہان	۱۰۳۴ھ	حسنات العارفين فارسی
۱۳	مولوی حاجی محی الدین کاشمیری (وفات ۱۹۲۱ء)	۱۳۲۱ھ	تاریخ کبیر کشمیر فارسی
۱۴	بابا داؤد مشکواتی کاشمیری	۱۰۶۳ھ غیر مطبوعہ	اسرار الابرار فارسی
۱۵	خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کاشمیری مولانا خواجہ کمال الدین شیخ	تصنیف ۱۱۲۸ھ " "	تاریخ خواجہ اعظمی روضہ قیومیہ
۱۶	محمد احسان معصومی مخدومی	" "	سجتہ المرجان عربی
۱۷	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	" "	سکینۃ الاولیاء ترجمہ اردو
۱۸	شہزادہ داراشکوہ بن شاہجہان	" "	

اگر زیادہ تجسس سے کام لیا جائے اور عربی اور فارسی کے تذکروں اور علامہ ممدوح کی تصنیفات پر گہری نظر ڈالی جائے تو ممکن ہے کچھ اور حالات بھی دستیاب ہو سکیں۔ لیکن زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو جمع ہو چکا ہے اس کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ مختصر سے حالات جو علامہ عبدالحکیم کی روشن زندگی کے دھندلے سے نشان ہیں۔ اس شخص کو خضر راہ کا کام دے سکیں۔ جو اس معمولی سی بنیاد پر اپنے وسیع علم اپنے روشن دماغ اور اپنی اعلیٰ قابلیت سے ایک عالیشان اور فلک نما عمارت تیار کر سکتا ہو۔

میں سیالکوٹ کے محترم بزرگ شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب پروفیسر عربی مرے کالج سیالکوٹ اور فدائے ملک و قوم آغا محمد صفدر خاں صاحب بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی سیالکوٹی صدر پنجاب خلافت کمیٹی لاہور (حال مقیم سیالکوٹ) کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ صاحب اول الذکر نے میرے استفسار پر مولانا کے حالات کے لیے مجھے بعض کتابوں کے نام بتائے۔ اور صاحب مؤخر الذکر نے کتابوں کی ایک معقول تعداد فروخت کرانے کا وعدہ فرمایا۔

اس کتاب کا مسودہ ۱۶ فروری ۱۹۲۳ء کو میں نے از سر نو ترتیب دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ تو نئے مطالعہ و معلومات کی وجہ سے ترمیم و اضافہ کی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ اور بڑی وجہ یہ تھی کہ کتاب کا مسودہ دیگر مسودات کے ساتھ ایک الماری میں پڑا رہا۔ جہاں چوہوں نے کاٹ کاٹ کر اکثر جگہ سے اس کو خراب کر دیا۔ دوسری دفعہ اس مسودہ کی ترتیب و کتابت نے روزانہ تین چار گھنٹوں کے حساب سے صرف تین ہفتوں میں مجھے فارغ کر دیا۔

محمد الدین فوق۔ لاہور

شروع مسودہ

متوطن گھڑتل۔ ضلع سیالکوٹ

۱۶ فروری ۱۹۲۳ء بوقت شب

دفتر اخبار کشمیری

جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ

ختم مسودہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۳ء

وطن..... خاندان اور پیدائش

علامہ عبدالحکیم کا وطن سیالکوٹ تھا۔ یہیں عہد اکبری میں پیدا ہوئے۔ یہیں پرورش پائی۔ یہیں پھلے پھولے اور آخر یہیں انتقال کیا۔

روضۃ الادبا میں ان کے والد کا نام شیخ شمس الدین لکھا ہے۔ معلوم نہیں۔ کس خاندان سے تھے اور کیا کاروبار کرتے تھے۔ لفظ شیخ بزرگی کی وجہ سے بولا جاتا تھا۔ یا نو مسلم ہونے کے لحاظ سے۔ یا مولانا کی شہرت نے باپ کی عزت کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ افسوس ہے کوئی تاریخ اور کوئی کتاب اس امر پر روشنی نہیں ڈال سکتی۔

کسی کتاب میں تو نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن سیالکوٹ میں عام طور پر سینہ بسینہ یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ مولانا عبدالحکیم ایک گننام خاندان اور نہایت ادنیٰ قومیت رکھتے تھے۔ لیکن مولانا اگر فی الواقعہ اعلیٰ ذات سے نہیں تھے تو یہ اور بھی خوبی کی بات ہے۔ اور اسلام نے جو آزادی اور مساوات کی تعلیم دی ہے۔ اُن کی ترقی اُن کی نہ مٹنے والی شہرت اس کا ایک بدیہی اور روشن ثبوت ہے۔

بعض قوموں کے خیال میں بعض قومیں قدرتی اور ازلی طور پر غلامی اور گننامی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں قدرت نے خود قوموں کی تقسیم کر دی ہے۔ جس قوم کے حصے حکومت و امارت آگئی ہے وہ اسی زعم باطل میں مبتلا ہے۔ کہ بس اب قیامت تک ہمارا ہی طنطنہ بختار ہے گا۔ جو قوم غریب۔ پسماندہ اور محکوم ہے۔ اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ فاتح قوم کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ جبر و تشدد کی آماجگاہ سمجھی جا رہی ہے۔ لیکن اسلام اس بات کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ غلامی کو مٹانے اور حریت صادقہ کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے دنیا میں آیا۔ اور جب تک (انشاء اللہ قیامت تک) جہاں کہیں

(خدا کرے ہر جگہ) حقیقی اسلام موجود رہے گا۔ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

اسلام نے حبشیوں اور غلاموں اور چھوٹے درجہ کے لوگوں کو نہ صرف اپنے برابر بٹھایا بلکہ ان کو اپنے خون میں مشترک کیا۔ رشتے دیئے۔ نسلی تعصبات مٹائے جو جاہل تھے ان کو عالم بنایا۔ جو کفر و ضلالت میں مبتلا تھے ان کو نور اسلام سے منور کیا۔

حسن زبصرہ بلال از حبش سہیل از روم

زخاک مکہ ابو جہل ایں چہ بواجبی است

ابن خلدون کی مشاہیر اسلام۔ فرید الدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء۔ آزاد بلگرامی

کا مآثر الکرام۔ اور دوسرے تذکرے دیکھو۔ تم بڑے بڑے علماء۔ صلحاء اور فقہاء کا جب

حسب و نسب دیکھو گے تو تم کو بیشتر ان میں موچی، کبھار، بافندے، دھوبی، درزی، آہنگر،

زرکوب، عطار اور ایسے ہی اور پیشہ ور نظر آئیں گے جن کا کام کاج جن کا پیشہ۔ جن کے

مشاغل۔ جن کی گذراوقات تمہاری ان نظروں میں جو دنیاوی وجاہت کی متلاشی اور دلدادہ

ہیں۔ حقیر و ذلیل معلوم ہوگی۔ لیکن جو خدا کی جناب میں اپنے ”اتقا“ کی وجہ سے ”مکرم“ اور

اپنے کسب حلال کی وجہ سے ”حبیب“ ہیں۔

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر

توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اسلام وہ چشمہ فیض ہے کہ بلا تیز قومیت و رنگت سب کے لیے وقف ہے۔

عورت، مرد، خوردکلاں، امیر غریب، سید مغل، اسلام نے دینی و دنیوی نافع و کارآمد علوم کی

تحصیل سب کے لئے لازم کر دی ہے۔ اس لئے کہ سب بے علم نہ توں خدا را شناخت علم کو کسی

خاص فرقہ خاص شخص، خاص قوم، خاص خاندان یا کسی خاص ملک کی میراث نہیں بنایا۔

اول تو کسی کتاب۔ کسی تاریخ۔ کسی تذکرہ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ مولانا عبدالحکیم

جلاہ یا بافندہ تھے۔ لیکن اگر تھے بھی۔ تو بھی جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ فخر کا باعث تھے۔ اُن کی ذات اس قابل ہے کہ اس کو خضر راہ بنایا جائے۔ اور لوگوں کو دکھا دیا جائے کہ اگر ایسے لوگوں کو جو کس میرسی کی حالت میں ہیں۔ اور جو اپنی ناداری و کم مائیگی کی وجہ سے اپنی ترقی و شہرت کے ظاہری اسباب سے محروم ہیں۔ ذرا سی بھی جرأت دلائی جائے یا ان کو اظہارِ قابلیت کا موقع دیا جائے۔ تو وہ کس طرح زمین سے آسمان۔ فرش سے عرش۔ تانبہ سے سونا۔ خاک سے کیمیا اور ذرہ سے آفتاب بن سکتے ہیں۔

ذرہ کا بھی چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہیں

مولانا کے ایک ہم جماعت نواب سعد اللہ خاں تھے۔ جو چینیوٹ کے ایک معمولی زمیندار کے لڑکے تھے۔ لیکن جب ان کے دل و دماغ نے قوت حاصل کی۔ ان کی ذہانت و ذکاوت کے جوہر کھلے۔ اُن کے استاد مولانا کمال نے ان کی تعلیم و تدریس میں خاص دلچسپی لی۔ تو وہ اپنے زمانہ کے علامی و فہامی کہلائے بلکہ شہنشاہ شاہجہان کے دستور معظم بنے۔ اور بادشاہ کی نظروں میں یہاں تک قرب و اقتدار حاصل کیا کہ داراشکوہ جو ولی عہد اور بادشاہ کا سب سے پیارا بیٹا تھا اس کو اپنا مد مقابل سمجھتا اور اس سے خوف کھاتا تھا۔

مولانا ایک غریب خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے ابتداء میں چونکہ گننام اور غیر معروف تھے۔ اس لئے ان کے سال پیدائش کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ البتہ اتنا تذکرہ ضرور آیا ہے کہ عمر بڑی پائی ہے۔ اور انہوں نے اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ دیکھا ہے۔

اب مجبوراً ہمیں ان کا سال پیدائش دیکھنے کے لیے کسی قدر قیاسات سے کام لینا

پڑے گا۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہم سبق تھے۔ اور

ہم مکتبی بلکہ فارغ التحصیل ہونے کے زمانہ میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بقول صاحب سالک السالکین سترہ (۱۷) سال کی تھی۔ اور ہم مکتب دہم درس ہونے کی وجہ سے غالب قیاس ہے۔ کہ ہم عمر ہوں یا زیادہ سے زیادہ دو چار سال کا فرق ہو۔ بلکہ اس خیال سے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ مولانا شاید عمر میں چند سال ان سے بڑے ہی ہوں۔

حضرت مجدد الف ثانی بزمانہ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ لغایت ۱۰۱۴ھ) ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر مولانا عبدالحکیم کو حضرت مجدد سے چار سال بھی بڑا سمجھا جائے تو ان کا سال پیدائش ۹۶۸ھ نکلتا ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر کو تخت ہندوستان پر مسند نشین ہوئے صرف چھٹا سال گذر رہا تھا۔

مولانا کی پرورش اور تربیت اسی طرح ہوئی جس طرح غریب والدین کے بیٹوں کی ہوتی ہے۔

ان کی پیشانی سے ستارہ بلندی کی جھلک ضرور دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان کی غربت اس پر پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ اور سوائے اس عالم الغیب کے کوئی تنفس ان کے شاندار مستقبل اور ان کی لازوال شہرت سے آگاہ نہ تھا۔

فاضل سیالکوٹی کا استاد

اکبر نے جب سنہ میں کشمیر کو سلطنت ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو وہاں مغل گورنر مقرر ہونے لگے۔ جن کو ناظم یا صوبہ کہتے تھے۔ اسی زمانہ میں کشمیر کے ایک جید عالم کسی بات پر اکبری گورنر سے ناراض ہو کر سیالکوٹ چلے آئے۔ جہاں ان کے کئی ہم وطن اس زمانہ سے موجود تھے۔ جب تاتار خاں حاکم لاہور تھا اور ہندوستان کا تخت شیر شاہ سوری کے پاؤں

چوم رہا تھا۔ اور کشمیر کے شیعہ چک بادشاہ علمائے اہل سنت سے اس قدر ظلم و تعصب سے پیش آرہے تھے۔ کہ کئی سنی مسلمان ظلم و جبر برداشت نہ کر کے جلا وطنی پر مجبور ہو جاتے تھے۔

اس جید عالم اور اس فاضل بزرگ کا نام مولانا کمال الدین تھا۔ سیالکوٹ اس وقت راجہ مان سنگھ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا کردار بڑی عزت سے پیش آیا اور عوام الناس اور خصوصاً ان کے ہموطنوں نے مولانا کمال الدین کے آنے پر بڑی خوشی ظاہر کی۔

کشمیر کی تاریخوں میں مولانا کمال کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ ان کا کچھ خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مولانا کمال الدین مولانا جمال الدین کے بھائی اور حضرت بابا فتح اللہ حقانی کے مرید و داماد تھے۔ خواجہ عبدالشہید احراری نقشبندی کے ارادت یافتہ بھی تھے۔ انہی دو بزرگوں کی فیض صحبت اور توجہ ظاہری و باطنی سے ”علامہ مشرقین“ اور ”معلم ثقلین“ مشہور تھے۔ مولانا داؤد مشکواتی اسرار الابرار میں آپ کے حالات میں لکھتے ہیں:

جن و انس اندر تعلم پیش آن آگاہ بود

بؤ رضا ملا کمال الدین ازیں درگاہ بود

کشمیر کے بہت سے تذکروں میں لکھا ہے کہ مولانا کو عالم جنات پر بھی فتوحات حاصل تھیں۔ ہم صرف اسرار الابرار سے کہ عہد شاہجہان کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف بابا داؤد مشکواتی نے مولانا کمال کے ایک شاگرد سے ملاقات کی ہے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

بابا داؤد مشکواتی لکھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ اپنے پیر کی خدمت میں تبت کے ملک

میں تھا۔ وہاں مولانا کمال الدین کے ایک شاگرد سے ملاقات ہوئی جس نے مولانا کمال کے کمال کی بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس نے بیان کیا کہ میں مولانا کمال کے مدرسہ لاہور

میں پڑھتا تھا۔ محمد رضا کہ اپنی حکمت و دانائی اور اپنے تجربہ علم کی وجہ سے حکیم دانا کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ مولانا کے فرزند تھے۔ اور میرے ہم سبق۔ مولانا ہم سب کو درس دے رہے تھے کہ ایک مرد نورانی نے مولانا کی خدمت میں آ کر تعلیم کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے بخوشی قبول فرمایا۔ چونکہ اس شخص سے پہلے کسی کی ملاقات نہ تھی۔ بلکہ کسی نے اس کو دیکھا تک بھی نہ تھا۔ اور اس کے چہرہ سے سفر و کوفت کے آثار بھی ظاہر نہ تھے بلکہ چہرے سے ایک نور برس رہا تھا۔ اس لیے طلباء نے تعجب سے اس کا وطن وغیرہ پوچھا۔ اور سفر کی کیفیت دریافت کی۔ مولانا کو خبر ہوئی۔ انہوں نے طلباء کو دریافت حالات اور استفسارات سے منع فرمایا چونکہ انسان حریص ہے۔ خصوصاً جس بات سے اس کو منع کیا جائے اس کی خواہش اس کو زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم سب نے درس کے بعد اس کو گھیر لیا۔ اور اس سے پھر وہی استفسار کیا۔

ہمارے استفسارات سے تنگ آ کر اس مرد نورانی نے ایک جست لگائی۔ اور مدرسہ کی دیوار کو ایک ہی چھلانگ میں طے کر گیا۔ ہم سب انگشت بندھا رہ گئے۔ اور ہمت کر کے اس کے پیچھے دوڑے۔ دیکھا۔ کہ ایک گڑھے میں جہاں چند پاک و تازہ ہڈیاں بھی موجود تھیں۔ بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے۔ تو اس نے خفگی کے لہجہ میں کہا تم نے کیوں ایسا کام کیا۔ کہ مجھ کو ایسے قابل استاد کی صحبت سے محروم ہونا پڑا۔ ہم نے کہا ہم تمہارا راز کبھی افشاں کریں گے۔ تم استاد کی صحبت ترک نہ کرو۔ اس نے کہا۔ ہمارے آدلبٹ و رسوم کے یہ خلاف ہے کہ جہاں ہمارا راز ظاہر ہو جائے وہاں ہم اپنی بود و باش رکھیں یہ کہہ کر وہ پھر ایسا غائب ہوا کہ کبھی اس کی صورت نظر نہ آئی۔

جب اس واقعہ کا علم مولانا کمال کو ہوا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ میں نے تم کو اسی خیال سے منع کیا تھا کہ ایک مومن بھائی کو تکلیف دینا حرام ہے۔ مگر تم لوگوں نے میرا کہنا نہ مانا۔

مولانا کمال کے شاگرد کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ سیالکوٹ کے مولانا لاہور میں بھی ایک درسگاہ رکھتے تھے۔ اور یہ کہ لوگ دُور دُور سے حصول علم کے لیے کھچے چلے آتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے زمانہ سے لیکر اکبر کے ابتدائی عہد تک میاں وارث کشمیری سیالکوٹ کا ایک نامور مالکدار اور جاگیر دار گذرا ہے۔ مولانا کمال الدین نے ان کی علیشان مسجد میں قرآن۔ حدیث اور دیگر علوم کا درس جاری کیا۔ جہاں علوم کے پیاسے جوق در جوق آ کر سیراب ہونے لگے۔ مولانا کے فیض صحبت اور تعلیم کی برکت سے فقہ، حدیث، تفسیر اور منطق و فلسفہ میں ایسے ایسے نامور لوگ پیدا ہوئے کہ مولانا کے کمال کی چاروں طرف شہرت ہو گئی۔ جن شاگردوں نے استاد کا نام روشن کیا۔ ان میں ایک مولانا عبدالحکیم بھی تھے۔

تاریخ سیالکوٹ میں جو دوسری تاریخوں کی نسبت واقعات سیالکوٹ کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہونی چاہئے تھی۔ مولانا عبدالحکیم کے استاد کا نام ”عبدالکریم“ درج ہے۔ حالانکہ دیگر تمام قدیم و جدید تذکرے ان کا نام مولانا کمال الدین بتا رہے ہیں۔ جو صحیح درست ہے۔ مولانا کمال کا سنہ وفات ۱۰۱۰ھ بعہد جہانگیر بتایا جاتا ہے۔ آپ نے سیالکوٹ میں انتقال فرمایا۔ مگر اب مزار کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

آپ کے بھائی مولانا جمال الدین کا تھوڑا سا تذکرہ بھی یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ ان کا بھی عالم جنات سے تعلق رہا ہے۔ اور مولانا عبدالحکیم بھی اس عالم سے روشناس رہے ہیں۔

شیخ نصیر الدین ابوالفقراء کہ کشمیر کے نامور صوفیاء میں درجہ اختصاص رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ملا جمال الدین پرہیزگار وقت متقی زمانہ اور علم و فضل کا خزانہ تھے۔ بابا فتح اللہ

حقانی کے مریدوں میں تھے۔ میں نے علم حدیث انہی سے اکتساب کیا ہے اور انہی سے سند حدیث حاصل کی ہے۔ حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے مزار پر اکثر جاتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اس شدت کثرت کا سبب پوچھا۔ تو فرمایا۔ ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ عالم خواب میں تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے شیخ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ جمال! تو اس کو پہچانتا ہے۔ اس نے وہ کام کئے ہیں کہ کوئی شخص ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس زیارت پر میری برابر آمدورفت ہے۔

بابا داؤد مشکوٰتی اسرار الابرار میں لکھتے ہیں۔ قاضی ابوالقاسم کہ مولانا جمال الدین کے خلف اور اکابر علماء سے تھے۔ اور مجھ مسکین کے استاد۔ وہ ایک دن لکڑی کا ٹٹے کے لیے ایک درخت پر چڑھے۔ درخت بڑا قد آور تھا۔ اور ایک جن کا مسکن تھا۔ درخت پر بڑی مشکل سے ضرب پڑتی تھی۔ جن کو جب تکلیف پہنچی تو وہ آدمی کی شکل اختیار کر کے مولانا کی خدمت میں آیا۔ اور اپنی تکلیف بیان کی۔ مولانا نے اپنے صاحبزادہ کو اس کام سے منع فرما دیا۔

مولانا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی وہ بھی بہت مدت کے بعد تھوڑا سا شوربہ پی لیتے تھے۔ سوائے موٹے پٹو کے ایک لمبے کرتے کے جس کو کشمیر میں پھرن کہتے ہیں۔ کوئی اور لباس نہیں پہنتے تھے۔ بورے پر کسی قسم کا فرش نہیں بچھاتے تھے۔ نہ بچھانے کی اجازت دیتے تھے۔ فرماتے تھے۔ جس شخص نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا وہ سلطان جمیع اجسام ہے۔ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے

ہر کہ رادر کار حق انجام شد کار او در جملہ اجسام شد

سری نگر میں کہ کشمیر کا درار الخلافہ ہے۔ انتقال فرمایا۔

علامہ عبدالحکیم کے ہم مکتب

سیالکوٹ اور سیالکوٹ کی ”مسجد میاں وارث“ کو جو کشمیری محلہ میں ابھی تک موجود ہے۔ یہ شرف رہا ہے کہ وہاں نہ صرف مولوی عبدالحکیم صاحب جیسی علامہ روزگار ہی پڑھتے رہے ہیں بلکہ نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہان اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی بھی پڑھتے رہے ہیں۔

”آثار خیر“ میں لکھا ہے ”ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کا ہندوستان کے مشہور علماء و فضلاء میں شمار ہوتا ہے۔ علامہ سعد اللہ خاں کے ساتھ ملا کمال کشمیری سیالکوٹی سے پڑھتے تھے۔ سعد اللہ خاں سبق میں ان سے پیچھے تھے۔ مگر قسمت کے معاملہ میں ان سے زیادہ پیش قدم نکلے۔ اور علامی کے خطاب سے موصوف ہو کر بڑھتے بڑھتے شاہجہان کے وزیر ہو گئے۔“

صاحب مسالکین۔ آثار خیر۔ تاریخ سیالکوٹ صدی۔ روضہ قیومیہ اور صاحب زبدۃ المقامات نے جو حضرت مجدد الف ثانی کے عقیدتمندوں میں تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کو مولانا عبدالحکیم کا ہم مکتب اور مولانا کمال کا شاگرد بتایا ہے۔

تاریخ کپورتھلہ میں جو ایک ضخیم سرکاری تاریخ ہے۔ میری نظر سے مولانا کمال کا ایک اور نامور شاگرد بھی گزرا ہے۔ جس کا نام اخوند عبداللطیف تھا۔ اخوند صاحب سلطان پور ریاست کپورتھلہ کے رہنے والے تھے۔ تاریخ مذکور میں لکھا ہے۔ سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان کے ساتھ اخوند عبداللطیف نے بمقام سیالکوٹ ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی شاہجہان نے ایک مرتبہ شاہزادوں کی تعلیم کے لیے آپ کو وہلی بلوا بھیجا۔ مگر آپ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے زیادہ تکلیف دینی مناسب نہ سمجھی اور شاہزادوں کو بمقام سلطان پور اخوند صاحب کی خدمت میں بغرض حصول تعلیم بھیج دیا۔ جہاں شاہزادے کچھ عرصہ تک زیر تعلیم رہے۔

مولانا کمال کی درسگاہوں سے صد ہا بلکہ ہزار ہا طالبان علم دستار فضیلت لے کر نکلے ہوں گے۔ مگر مندرجہ ذیل صاحب کمال تین شاگردوں علامہ عبدالحکیم، حضرت مجدد الف ثانی اور علامی وفہامی نواب سعد اللہ خان نے تو واقعی استاد کے نام کو بقائے دوام کا خلعت پہنا دیا۔

مولانا عبدالحکیم کے دونوں یگانہ دہر۔ ہم مکتبوں کا ذکر آیا ہے تو خیال بے اختیار عمر خیام نیشاپوری کے دونوں جلیل القدر ہم مکتبوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے جن میں ایک شاہان سلجوق کا نام روزیر بنا۔ جس کا نام نظام الملک طوسی تھا۔ اور ایک نے نیاندہب باطنیہ ایجاد کیا۔ اور جس کی کئی پشتوں میں بادشاہی دور دورہ رہا۔ اس کا نام حسن بن صباح تھا۔ خود عمر خیام اعلیٰ درجہ کا فلسفی شاعر تھا۔ جس کی رباعیات اب تک مقبول عام ہیں۔

مولانا عبدالحکیم کے ہم مکتب بھی کچھ کم مشہور نہیں ہوئے۔ سعد اللہ خاں نواب کہلایا ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب دار بنا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پھٹے پرانے بوریے پر بیٹھے والا۔ صاحب قران شاہجہان کا دستور معظم بنا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے تو ظاہری و باطنی علوم میں وہ عروج حاصل کیا کہ بڑے بڑے شہنشاہ ان کی چوکھٹ کی جبہ سائی کرتے رہے۔ آپ نے تصوف و طریقت کو دوکاندار صوفیوں سے ایسا صاف کیا کہ طریقت و شریعت میں کوئی فرق نہ رہا۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اب بھی آپ کی قبر کی زیارت کے لیے سرہند تشریف لے جاتے ہیں۔ عمر خیام نے اگر شاعری میں شہرت حاصل کی تو مولوی عبدالحکیم نے منطق۔ فقہ۔ حدیث۔ تفسیر میں نام پیدا کیا کہ ہندوستان کے علاوہ مصر، قسطنطنیہ، حجاز، بخارا، مراکش (حضرت شاہ صاحب قبلہ علیپوری نے ایک مرتبہ بمقام لاہور فرمایا کہ ہم ایام حج میں مقام نبیوع میں تھے چند مراکش مشائخ اپنے خیمہ ڈیرہ سے نکل کر اور یہ سن کر کہ میں شیخ ہندی کے پاس آئے اور پوچھا کیا تم ہندی ہو؟ میں نے

کہا۔ ہاں۔ مراکشی شیخ نے پوچھا۔ کیا سیلکوٹ (سیالکوٹ) کو بھی جانتے ہو؟ میں نے کہا وہ تو میرا وطن ہے۔ پھر کہا۔ مولائے عبدالحکیم سیلکوٹی تمہارے ہم وطن تھے؟ میں نے کہا۔ ہاں یہ کہہ کر فرط محبت و شوق سے تمام مشائخ یکے بعد دیگرے مجھ سے بغلگیر ہوتے رہے۔ تک ان کا نام مشہور ہے۔

آخر کبھی کسی نے غور بھی کیا؟ کہ مسجدوں کے ٹوٹے پھوٹے بوریوں اور پھٹی پرانی چٹائیوں پر بیٹھنے بلکہ سونے والے۔ ہاتھوں اور کتابوں بلکہ اینٹوں کا سرہانہ بنانے والے۔ پھٹے ہوئے کپڑے بلکہ چیتھڑے پہننے والے۔ اس زمانہ میں جبکہ ریل گاڑی نہ تھی۔ موٹریں اور فٹنیں نہ تھیں۔ رستے ایسے پر امن نہ تھے۔ رشتہ داروں سے، عزیزوں سے، اپنے وطن سے جدا ہوتے تھے۔ اور جب مسجدوں کے حجروں سے جہاں موجودہ روشنی کے زمانہ میں نئے تعلیم یافتہ اگر آجائیں تو شاید ان کا دم گھٹنے لگے۔ ان چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں سے جن کو شاید موجودہ زمانہ میں بلیک ہول کہہ سکتے ہیں نکلتے تھے۔ تو کیوں ان کو علامہ زمانہ۔ فہامہ دور ان فقیرہ فاضل، محدث کامل، قلب الاقطاب اور جامع علوم ظاہری و باطنی کے خطابات ملتے تھے۔ کیا وجہ تھی کہ لوگ دیوانہ وار ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اور ان کی ادنیٰ سی ادنیٰ خدمت کو بھی فخر کا باعث بلکہ ”حاصل زندگانی“ سمجھتے تھے۔

ملاکمال بے یار و مددگار اپنے ملک (کشمیر) سے نکلتا ہے۔ لیکن جب وہ پنجاب میں آتا ہے تو لوگ اسے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ حاکم اس کا ادب کرتے ہیں۔ زبان الگ ملک الگ۔ لباس اور طرز معاشرت الگ۔ لیکن خلقت ہے کہ جوق در جوق اس کے پاس آتی ہے۔ ادبائے وقت اور فضلاء عصر اسے ”محقق سیالکوٹی“ بلکہ ”علامہ مشرقین“ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں!

سعد اللہ جو پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ اپنے وطن چنیوٹ سے باہر نکلتا ہے۔

لاہور اور سیالکوٹ میں حصول تعلیم کے بعد شاہجہان جیسے عظیم القدر شہنشاہ کا وزیر ہوتا ہے۔ جس کی حضوری و حاضری کے لئے بڑے بڑے راجے۔ مہاراجے اور نواب اور صوبیدار اور جاگیردار پہروں کھڑے رہتے تھے۔

شیخ احمد سرہندی جب فارغ التحصیل ہو کر مسجدوں کے حجروں اور معمولی سے درس گاہوں سے باہر نکلتے ہیں تو علامہ ابوالفضل اور ملک الشعرائے فیضی جن سے بڑھ کر عہد اکبری میں کسی کو تقرب شاہی حاصل نہ تھا۔ ان سے ملاقات کرنا۔ اور ان کے پاس جانا باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور جب دنیا ان کے کمالات سے آگاہ ہوتی ہے تو اسی شیخ احمد سرہندی کو زبان خلق سے سلطان طریقت۔ برہان حقیقت۔ امام الشریعت۔ حضرت مجدد الف ثانی اور فضائے آسمانی سے خزینۃ الرحمت کے خطابات ملتے ہیں۔

آخر کیا وجہ تھی؟ کیا سبب تھا؟ کہ زمانہ سابق میں معمولی لوگ غیر معمولی طور پر عزت و شہرت اور علم و فضل میں کمال حاصل کر لیتے تھے۔ ان کو سامان آرائش و راحت بھی میسر نہ تھے۔ بلکہ بعض حالات میں تو گدائی کر کے شکم پر پی گرنی پڑتی تھی۔ وہ ایثار و اخلاص۔ وہ حقیقی تڑپ جو شارع اسلام نے ہم کو بتائی ہے کہاں ہے؟ کس جگہ ہے؟ اور کس طرف ہے؟ اسی ایثار و اخلاص اور اسلام کی اسی حقیقی تڑپ کے نہ ہونے سے ہمارا وہ حال ہے کہ خود ہمیں ہی اپنے حال پر کہنا پڑتا ہے

ع اللہ برا حال ہو ایسا نہ کسی کا

نواب سعد اللہ خاں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوں۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کہلائیں۔ مولانا عبدالحکیم علامہ وفہامی مشہور ہوں اور تینوں ہم مکتب رہیں اور پھر ان کی باہمی خط و کتابت۔ علمی بحث مباحثہ۔ شریعت و طریقت۔ منطق و فلسفہ اور فقہ و حدیث کے زموز و نکات کے انکشافات سے دنیا بے خبر ہو! کس قدر افسوس و حسرت کا مقام ہے ان

تینوں یگانہ روزگار ہم مکتبوں میں سے صرف حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات شریف محفوظ ہیں یا بعض ایسی کتب موجود ہیں جن میں حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء وغیرہ کے حالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ باقی دونوں اصحاب کے ملفوظات کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ایام طالب علمی میں جو لطیف علمی بحث آپس میں ہوتی ہوگی۔ اور مولانا کمال جیسا با کمال استاد جس ترکیب سے علمی دقائق کی موثر گافیاں کرتا ہوگا۔ کاش ان کا پتہ چل سکتا!



مولانا عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی

علامہ عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی کے باہمی تعلقات کی کچھ کیفیت زبده المقامات اور روضہ قیومیہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم دونوں کا خلاصہ یہاں درج کر کے دونوں نامور ہم مکتبوں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے سے پہلے حضرت مجدد کے مختصر سے ابتدائی حالات بھی لکھتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی ۱۲ شوال ۱۰۹۷ھ کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر ابھی اسلام اور علمائے اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بقول صاحب دربار اکبری وہ مسجدوں میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔ نمازیں پڑھتا اور علمائے اسلام کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کرتا تھا۔ ملا عبد القادر بدایونی اس کا پیش امام تھا۔ اور علماء و صلحاء کا جمگھٹا اس کے گرد رہتا تھا۔

اکبر ۱۶۱۳ھ میں تخت پر بیٹھا۔ اور اٹھارہ سال یعنی ۱۶۸۱ھ تک وہ ایک خالص مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے ہندوستان پر فرمانروائی کرتا رہا۔ اس کے بعد جب اس کے دربار میں ابوالفضل۔ ملک الشعراء فیضی۔ راجہ بیربر۔ ٹوڈرل اور دوسرے لوگ آتے ہیں اور اپنی ملکی مصلحتوں سے اور اپنے منطق و فلسفہ کے زور سے اس کے دین و ایمان کو متزلزل کرتے ہیں تو ہندوستان میں اسلام کی حالت ضعیف و ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔

اکبر اپنی ملکی مصلحتوں اور اپنی ہندو رائیوں کے پاس خاطر سے زنا رہتا ہے۔ بت بنانوں میں جاتا ہے۔ ڈاڑھی منڈا ڈالتا ہے۔ کبھی کبھی پیشانی پر تشقہ بھی لگا لیتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں شرکت کرتا ہے۔ درباری آداب کی ابتداء سجدہ سے ہوتی ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ مسلمانوں کا۔ ان کے مذہب کا اور عالمان دین کا مذاق اڑایا جاتا۔ اور ان پر

استہزاء کیا جاتا ہے۔ الحاد و فلسفہ کی کتابیں تحریر کی جاتی ہیں۔ علماء و صلحائے عصر۔ ابوالفضل و فیضی کے عروج و اقبال کے سامنے خاموش۔ اور اہل دین گرداب حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۹۸ھ تک آپ نے اپنے والد ماجد مخدوم عبدالاحد سے تحصیل علوم کی۔ پھر سیالکوٹ جا کر مولانا کمال کاشمیری سے جو محقق و مدقق علامہ روزگار عابد و زاہد تھے۔ معقولات کی کتابیں جن میں مولانا ممتاز تھے۔ نہایت تحقیق و تدقیق سے پڑھیں اور حدیث کی سند مولانا یعقوب صرہی کاشمیری سے جو شیخ خوارزمی کبروی کے خلیفہ اعظم اور اپنے زمانہ کے محدث اعظم تھے..... حاصل کی۔ بلکہ سلسلہ کبروی میں آپ مولانا صرہی کے مرید ہوئے۔

یہ تمام علوم آپ نے ۲۱ سال یعنی سن بلوغت سے قبل ہی حاصل کر لئے۔ یا دوسرے الفاظ میں ۹۹۲ھ میں آپ تمام ظاہری علوم سے فارغ ہو گئے۔ اور واپس آ کر سرہند ہی میں اپنے والد ماجد کے حضور میں طلباء کو درس دینے لگے۔

آپ نے ابوالفضل اور فیضی سے آگرہ میں کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ اور علوم فلسفہ پر ان سے کئی مرتبہ بحث کی ہے۔ بلکہ انہی مناظروں کی بنا پر ایک کتاب بھی اثبات نبوت کے نام سے لکھی ہے۔ ابوالفضل وغیرہ نہ صرف فرشتوں کے وجود سے منکر تھے بلکہ ان کو آنحضرت ﷺ کی نبوت پر بھی یقین نہ تھا۔ اسلام کے لئے یہ بڑا نازک زمانہ تھا۔ حضرت مجدد صاحب نے احیائے سنت و شریعت کے لیے نہ وزیر کی پرواہ کی نہ بادشاہ کی۔ جو کچھ اللہ اور اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اس کا برملا ذکر کرتے رہے۔ آپ کو تکلیفیں بھی پہنچیں۔ بلکہ جہانگیر کے زمانہ میں بعض بدبین حاسدوں کی وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید بھی رہے۔ مگر اظہار حق اور اشاعت سنت و اتباع شریعت کے معاملات میں کسی سے نہ ڈرے۔ آخر جہانگیر نے معافی مانگی۔ شاہجہان (شاہزادہ خرم) مرید ہوا۔ اور دوسرے کئی علماء اور امرائے دربار نے آپ نے بیعت کی۔ آخر ۲۸ صفر ۱۰۳۲ھ کو بزمانہ جہانگیر آپ وفات پا گئے۔

تجدید الف و قومیت کا بارہواں سال تھا۔ اور سنہ ہجری ایک ہزار بائیس منزلیں طے کر چکی تھی کہ مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجددؒ میں زمانہ طالب علمی کے تیس سال بعد از سر نو تعلقات قائم ہوئے۔ اس طویل عرصہ میں دونوں نامور ہم مکتبوں کی شہرت دور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔ مولانا عبدالحکیم جاگیردار ہو چکے تھے۔ اور ان کے علم کلام۔ علم منطق و فلسفہ اور تفسیر و حدیث کی دھوم مسجد کے حجروں سے نکل کر امراء کے مکانوں۔ وزراء کے ایوانوں اور بادشاہ کے فلک نما محلوں تک جا پہنچی تھی۔ اور حضرت شیخ احمد سرہندی امام الشریعت۔ قیوم اول اور مجدد الف ثانی کے خطابات سے ممتاز تھے۔ اور سرہند صرف آپ کے دم قدم کی وجہ سے علم و فضل۔ علمائے عصر اور عابد لوگوں کا ایک مرکز ہو گیا تھا۔

۱۰۲۲ھ کا واقعہ ہے کہ مولانا کا ایک شاگرد جو تمام شاگردوں سے لائق۔ ذکی اور ذہین تھا۔ اور مولوی صاحب بھی اس کی رسائی طبیعت کی وجہ سے اس کو تمام شاگردوں سے عزیز سمجھتے تھے۔ اتفاقاً ایک مرتبہ متواتر چند یوم تک درس میں نہ آیا۔ مولوی صاحب نے ایک آدمی خبر کے لئے اور متواتر غیر حاضری کی وجہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ شاگرد اسی وقت حاضر خدمت ہوا۔ اور کہنے لگا۔ اس مسلسل غیر حاضری کی وجہ یہ تھی کہ چند ورق میرے ہاتھ لگے ہیں ان کے مطالعہ نے ایسی لذت دی اور ایسا استغراق پیدا کیا ہے کہ کسی اور کتاب کی طرف جی نہیں چاہتا۔ ساتھ ہی وہ چند اوراق نکال کر مولوی صاحب کو دیئے اور کہا کہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جب مولانا نے ان اوراق کا مطالعہ کیا تو اس میں ایسا کلام درج پایا جس کے علوم و معارف بالکل نئے اور شریعت عزا کے عین مطابق تھے۔ مولوی صاحب نے پوچھا یہ کس بزرگ کا کلام ہے۔ ایک شخص نے جو پاس ہی بیٹھا تھا اور سرہند میں حضرت مجدد صاحب کی مجلسوں میں شامل رہ چکا تھا کہا یہ کلام حضرت مجدد الف ثانی کا ہے۔ اس دن سے مولوی عبدالحکیم کو حضرت مجدد الف ثانی کے علوم و معارف کے

مطالعہ سے وہ لذت ملی کہ حضرت کی ذات خاص سے آپ کو دلی اعتقاد پیدا ہو گیا۔ اس واقعہ کو ابھی چند یوم ہی گزرے تھے کہ مولوی صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کو خواب میں دیکھا کہ وہ مولوی صاحب سے قرآن کی یہ آیت فرما رہے ہیں۔ ”قل اللہ ثم ذرہم فی خوضہم یلعبون“ مولوی صاحب جب خواب سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ سینہ کے اندر ایک نور برس رہا ہے۔ دل ہے کہ خود بخود ذکر کر رہا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ سارے بدن پر اس کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ دعا و توجہ کے لئے حضرت کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ اور لوگوں سے کہنے لگے میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی کا روئیسی ہوں۔

خواجہ ہاشم مصنف زبدۃ المقامات لکھتے ہیں۔ ایک روز حضرت قیوم اول کی مجلس میں تمام مرید حاضر تھے۔ وہاں ذکر چھڑا کہ آنجناب کی تجدید الف اور قیومیت ہم لوگوں پر تو اظہر من الشمس ہے۔ لیکن اگر کوئی عالم جو علمائے عصر میں مرتبہ بلند رکھتا ہو اور جس کی سند کو سب لوگ تسلیم کر لیں اس امر کی تائید کرے تو بہت اچھا ہو۔ خواجہ ہاشم جو مولانا محمد الہاشم کشمی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ لکھتے ہیں میں نے خود یہ الفاظ اپنی زبان سے حضرت قیوم اول کی خدمت میں عرض کئے۔ فرمایا مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کو جانتے ہو۔ آج اہل علم میں ان کا کیسا مرتبہ ہے؟ سب نے بالاتفاق عرض کیا۔ آج معقول و منقول میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ یکتائے زمانہ ہیں۔ آنجناب نے فرمایا۔ مولوی صاحب نے میری طرف ایک خط لکھا ہے۔ اسے دیکھو۔ یہ کہہ کر وہ خط ان کے آگے رکھا۔ جب کھولا گیا تو اس میں بہت سے مدحیہ فقرے آنحضرت قیوم اول کے بارہ میں تھے اور انہی میں یہ الفاظ بھی درج تھے۔ ”امام ربانی محبوب سبحانی مجدد الف ثانی“۔ اسی خط میں مولانا نے اپنی خواب کا واقعہ لکھا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا خط ہے جو مولوی عبدالحکیم نے حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا ہے۔ (روضۃ الادبا و روضۃ القیومیہ نے بھی اس خط کی تائید کی ہے۔)

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی مولوی عبدالحکیم کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ اور ان کے عطا کردہ خطاب مجدد الف ثانی کو آئینی تجدید کی بہترین سند سمجھتے تھے۔ وہ خطاب ایسا مشہور و مقبول ہوا کہ حضرت کے تمام خطابات قیوم اول ”خزینۃ الرحمۃ“ وغیرہ سے اس کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ بلکہ بہت لوگ ایسے ہیں جو اس مقبول عالم خطاب مجدد الف ثانی کے مقابلہ میں ان کے اصل نام ”شیخ احمد“ سے بہت کم آگاہ ہیں۔

مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی کے درمیان ۱۰۲۳ھ یا ۱۰۲۴ھ میں ایک ملاقات بھی ہوئی ہے۔ صاحب زبدۃ المقامات تو لکھتے ہیں مولوی صاحب ”قل اللہ ثم درہم“ کی تفسیر و تعبیر کے لئے خود سیالکوٹ سے سرہند آئے۔ روضۃ القیومیہ میں اس آیت کی تفسیر طلبی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ویسے لکھا ہے کہ مولوی صاحب خواب کے اس واقعہ کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔

حضرت مجدد اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم۔ سب سے بڑے مصنف و شارح اور اپنے قابل ہم مکتب سے بڑے اخلاص سے ملے۔ مولانا بہت دنوں تک سرہند رہے اور جب تک رہے ظاہری و باطنی علوم کی صحبتیں گرم رہیں۔

اسی ملاقات میں مولوی عبدالحکیم نے حضرت مجدد الف ثانی سے بیعت کی۔

مولوی عبدالحکیم نے تجدید الف کے اثبات میں ایک رسالہ بھی ”دلائل التجدید“ کے نام سے لکھا۔ روضیہ قیومیہ میں اس رسالہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں مولانا نے نہایت قوی دلائل و برہان بیان فرمائے ہیں۔

مولوی عبدالحکیم جب سرہند سے واپس آئے ہیں تو ان کے نام کے ساتھ دوبار قیومیت سے ”آفتاب پنجاب“ (دستہ الاوبا) کے خطاب و الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یعنی وہ وجود جو صرف علوم ظاہری کا آفتاب تھا اب باطنی و روحانی فیوضات میں بھی شمس بازغہ ہو کر نکلا۔

مولوی عبدالحکیم عہد اکبری میں

اکبر کی علمی قدردانی نے ہندوستان کے علاوہ ایران۔ توران۔ عرب و عجم۔ روم شام اور کشمیر جنت نظیر کے علماء فضلاء اور اہل کمال ہندوستان میں جمع کر رکھے تھے۔ آئین اکبری اکبر نامہ اور مولانا آزاد کی کتاب دربار اکبری میں علماء و فضلاء کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ مگر ان میں مولوی عبدالحکیم کا نام کسی جگہ درج نہیں ہے۔ جن کی عمر اکبر کے سنہ وفات ۱۰۱۴ھ تک ۴۵-۴۶ سال کے قریب تھی۔ اور جن کی علمی شہرت ہندوستان کے ہر گوشہ میں پر لگا کر اڑ رہی تھی۔

مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گوان کی رسائی اکبر کے دربار تک نہ ہو سکی تھی مگر وہ اکبر کے عالیشان مدرسہ لاہور میں سرکاری مدرس مقرر ہو گئے تھے۔ جہاں صدہا طلباء آپ سے علوم ظاہری حاصل کرتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کافی مدت تک لاہور میں مقیم رہے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ ”فاضل لاہوری“ کے نام سے مشہور ہو گئے چنانچہ حمد اللہ شارح سلم آپ کے قول کو ”قال الفاضل اللاہوری“ لکھ کر بیان کرتا ہے۔ روضۃ الادباء میں بھی آپ کے قیام لاہور کا ذکر ہے اور لکھا ہے۔ منطق میں علمائے پورب (صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) سے آپ کے اکثر بحث مباحثہ رہتے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوں گی۔ کیا کیا نکات ہوں گے۔ کچھ۔ ادھر سے دلیلیں کچھ ادھر سے برہان۔ ان مناظروں اور مباحثوں کی کیفیتیں کیسی دلچسپ ہوں گی۔ اور کن کن کتابوں سے جن کا آج شائد لوگ نام بھی نہ جانتے ہوں اپنے اپنے مطالب کے حوالے دیئے جاتے ہوں گے۔ تقریروں میں کیا متانت اور تحریروں میں کیسی مؤدبانہ لطافت ہوتی ہوگی۔ ان کا مزاج صرف عالم خیال ہی میں آ سکتا ہے۔

مولوی عبدالحکیم عہد جہانگیری میں

جب جہانگیر اپنے باپ (اکبر) کے بعد ۱۵۷۰ء میں تخت پر بیٹھا تو علماء و فضلاء کی قدر دانی میں اس نے اور بھی اضافہ کیا۔ ان کو جاگیریں دیں۔ سائیاں دیں تاکہ یہ لوگ اطمینان قلب سے اشاعت علوم کر سکیں۔ مولوی عبدالحکیم اس زمانہ میں لاہور کی سرکاری درسگاہ میں مدرس اعلیٰ تھے۔ ان کا شہرہ کمال بھی (معلوم نہیں کس ذریعہ سے؟) جہانگیر تک پہنچا۔ مدد معاش کے نام سے ایک معقول جاگیر مولانا کے نام مقرر ہوگئی۔

جہانگیر کی آپ پر خاص توجہ تھی۔ بادشاہی عنایات کی وجہ سے اب آپ اہل حشمت و صاحب وسعت ہو گئے تھے۔ علمائے ہند مسائل دینیہ میں آپ سے فتاویٰ طلب کرتے اور چونکہ اس زمانہ میں تعلیم بالکل مفت ہوتی تھی۔ اس لئے طلباء آپ کے درس میں دور دور سے آتے اور صاحب علم و فضل ہو کر نکلتے تھے۔

”آثار خیر“ میں عہد جہانگیری کے جن سولہ مسلمان عالموں کا ذکر ہے ان میں ایک نام مولانا عبدالحکیم کا بھی ہے۔ آپ عہد جہانگیر تک لاہور ہی میں قیام فرما رہے ہیں۔ لاہور کے صوفیائے کرام سے آپ نے بہت ملاقاتیں کی ہوں گی۔ مگر تاریخوں سے صرف یہی پتہ چلا ہے کہ حضرت میاں میرؒ سے ملاقات فرمائی ہے۔ جس کی کچھ کیفیت شہزادہ داراشکوہ کی کتاب سکینۃ الاولیاء سے ذیل میں لکھی جاتی ہے۔

ایک دن شہنشاہ جہانگیر حضرت میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملا عبدالحکیم بھی حاضر خدمت تھے۔ حضرت نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے پاس پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔ اول جذبہ کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یکبارگی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتا اور اس کو واصل بنا لیتا ہے۔ دوسرا سلوک جو ریاضت مجاہدہ اور کسی بزرگ کا دامن پکڑنے سے حاصل ہو سکتا

ہے۔ اس طریق کی تفصیل اس طرح ہے کہ سالک کا پہلا مقام ملکوت ہے۔ جب ریاضت کے زور سے وہ اس مقام پر کہ عالم ملکوت کا کشف اسی مقام سے شروع ہوتا ہے پہنچ جاتا ہے تو اس کا پیرا سے کسی طریقہ میں مشغول کر کے جنگل میں بھیج دیتا ہے۔ اور وہ باغوں اور جنگلوں میں تنہا یاد الہی میں مصروف ہو جاتا ہے اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ قرب حق کے حصول کے لیے خلقت سے کنارہ کشی ضروری ہے۔

مولانا عبدالحکیم حضرت میاں میر کے فضائل و مراتب سے آگاہ تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ بادشاہ ان کا عقیدہ مند ہے۔ اور ان کا بہت کچھ ادب و احترام کرتا ہے۔ اور شہر کے عام ہندو مسلمان بھی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ خود شہنشاہ اس وقت ان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ حضرت میاں میر کے ان الفاظ پر وہ خاموش نہ رہ سکے اور بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا۔

آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ عین رہبانیت کی تعلیم ہے۔ اور اسلام اس تعلیم کی اجازت نہیں دیتا (اگر اور باتوں کی طرف خیال نہ بھی کریں تو یہ تھوڑی بات ہے) کہ اس سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔

آنجناب (یعنی حضرت میاں جی) نے فرمایا۔ تعجب ہے کہ آپ ایسا فرماتے ہیں۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ نماز کی تحقیق کریں۔ اور دل کی حضوری حاصل کریں۔ تاکہ ان کی نماز درست ہو سکے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک دل کی حضوری نہ ہو نماز درست نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نماز باجماعت کا کیا فائدہ؟ یاد رکھو اگر..... آبادی سے دور جنگل میں بھی نکل جائیں تو بھی نماز باجماعت فوت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے یارا دھر ادھر کے جنگلوں کے تلے آبادی سے دور گوشہ تنہائی میں یاد الہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ہم سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔

داراشکوہ نے یہ قصہ یہیں تک لکھ کر ختم کر دیا ہے۔ آگے صرف اتنا لکھا ہے۔
بادشاہ (جہانگیر) اس مرتبہ بھی ایک پہر تک حضرت میاں جی کی خدمت میں حاضر رہا۔

مولوی عبدالحکیم اور شہنشاہ شاہجہان

اکبر کے زمانہ میں مولوی عبدالحکیم لاہور کے سرکاری مدرسہ میں مدرس اعلیٰ تو تھے لیکن ان کے کمالات کی شہرت بادشاہ تک نہ پہنچ سکی۔ یا کسی نے پہنچانی مناسب نہ سمجھی۔ جہانگیر کی نگاہ نکتہ رس نے ان کو تاڑا اور ان کی مدد معاش مقرر کر کے ان کی شہرت و عظمت کا بنیادی پتھر رکھ دیا۔

شاہجہان کا ابتدائی عہد تھا۔ کہ مولانا عبدالحکیم اکبر آباد (آگرہ) کے سرکاری مدرسہ میں جو اکبر کا جاری کیا ہوا تھا۔ مدرس اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے۔ حاجی محمد جان قدسی۔ (وطن شہد۔ مدفن کشمیر۔ سری نگر۔ دائرہ مزار الشعراء محلہ درگجن) جو شاہجہان کے زمانہ کا ایک نامور شاعر تھا۔ اور مولانا عبدالحکیم اس مدرسہ میں ایک ہی وقت میں استاد رہے ہیں۔

”خیر“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالیشان مدرسہ کی کچھ عمارت شروع انگریزی عہد تک موجود تھی۔ شہنشاہ اکبر۔ اس مدرسہ کے لئے شیراز سے چلی بیگ ایک نامی فاضل کو بلوایا تھا۔ ایک وسیع و خوبصورت مسجد بھی اس مدرسہ کے ساتھ تھی۔

کیا انقلاب زمانہ ہے جہاں مدرسہ کی عالیشان عمارت تھی۔ جہاں فقہ و حدیث اور تفسیر قرآن اور منطق و فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ جہاں علم و فضل کے دریا بہتے تھے جہاں ادب و تاریخ کا ہن برستا تھا۔ جہاں ملک کے نامور اور چیدہ علماء تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے۔ آج نہ وہاں مدرسہ ہے نہ دارالاقامہ کا کوئی پتہ ہے۔ البتہ مسجد مذہب کی پناہ میں آ کر اب تک موجود ہے۔ اور مدرسہ کے نام پر مسجد کے متصل ایک محلہ محلہ مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔

مولوی عبدالحکیم جہانگیر کے زمانہ میں جاگیر حاصل کرنے کی وجہ سے دربار میں بھی رفتہ رفتہ شہرت حاصل کر رہے تھے۔ شاہجہان کے زمانہ میں پہلے تو آگرہ بھیجے گئے۔ مگر بعد میں غالباً دربار میں بھی پہنچ گئے۔ اس لئے کہ اکثر کتابوں میں اس امر کا تذکرہ پایا جاتا ہے کہ ”ایران و توران اور عرب و شام تک کے علماء اور اہل کمال دربار شاہجہان میں موجود تھے۔ مگر ان سب میں بلحاظ قابلیت مولوی عبدالحکیم کا پایہ بلند تھا۔“

ان کے اس قدر عروج اور ان کی شہرت و عظمت اور شاہجہان کے دربار تک پہنچنے کی مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہم صرف یہاں دو روایتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک روایت جو سیالکوٹ کے ہر فرد و بشر اور پنجاب کے اکثر حضرات کو معلوم ہے یہ ہے کہ مولوی صاحب کے گھر میں ان کے خاندان سے کوئی عورت بیمار تھی۔ حکماء یا تجربہ کار عورتوں نے اس بیماری کا علاج تر و تازہ اور سبز لونگ بتایا۔ اس وقت چونکہ سبز اور تازہ لونگ کا ملنا محال تھا۔ اس لئے مولوی صاحب متفکر تھے۔ اسی اثناء میں ان کے مدرسہ کا ایک طالب علم شیرول نام ان کی خدمت میں آیا۔ ان کو متردد دیکھ کر سبب پوچھا۔ مولوی صاحب نے سبز لونگوں کی ضرورت ظاہر کی۔ طالب علم نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ سبز لونگ جس قدر مطلوب ہوں گے تھوڑی دیر تک حاضر کر دوں گا۔ چنانچہ وہ لڑکا مولوی صاحب سے رخصت ہو کر قریباً دو گھنٹہ تک ان سے علیحدہ رہا۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ دو گھنٹے اس نے کہاں گزارے۔ اور وہ اس عرصہ میں کیا کام کرتا رہا۔ لیکن دو گھنٹہ کے بعد جب وہ مولوی صاحب کے پاس آیا تو مولوی صاحب کے علاوہ اور لوگوں نے بھی دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں سبز لونگوں کا درخت معنیخ و بن موجود ہے اور اس کے ساتھ لونگ تر و تازہ ضرورت سے صد ہا حصہ زیادہ لگے ہوئے ہیں۔

لوگ حیران تھے لیکن مولانا کے ادب کی وجہ سے کچھ دریافت نہ کر سکتے تھے۔

مولوی صاحب نے لونگ تو گھر بھجوادئے۔ اور کسی دوسرے وقت تنہائی میں شیردل سے کہا تم جو کچھ ہو مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ اب تم مدرسہ سے چلے جاؤ۔ اور پھر کبھی یہاں آنے کا نام نہ لو۔ اس لئے کہ جنات کا انسانوں میں رہنا مناسب نہیں ہے۔

شیردل نے ہر چند منت سماجت کی اور کہا۔ میں جو کچھ ہوں آپ سے اب پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن آپ کا غلام اور فیض یافتہ ہوں۔ اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔ مولانا نے ایک نہ سنی۔ آخر وہ جن طالب علم زبان حال سے مع۔ بہر جا کہ باشم غلام تو ام۔ کہہ کر اور یہ الفاظ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ اگر زندگی ہے تو ضرور کسی وقت استاد کی کا حق ادا کروں گا۔ ورنہ ما بخیر شاہ سلامت۔

اس واقعہ کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ کہ دہلی میں ایک شہزادی سخت بیمار ہو گئی علاج معالجہ سے جب کوئی آرام نہ آیا تو سیانے لوگوں نے یہ بتایا کہ کوئی آسیب ہے جس نے شہزادی کو تنگ کیا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کمال آئے۔ ٹوٹکے اور افسوں ہوئے مگر وہ آسیب دور نہ ہوا۔ جب عامل تھک گئے تو وہ آسیب شاہزادی کی زبان سے کہنے لگا۔ میں وہ زبردست آسیب ہوں کہ جب تک مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی نہ آئیں گے۔ میں یہاں سے نہیں جاسکتا۔ بادشاہ نے صوبہ لاہور کی معرفت بہ اعزاز تمام مولوی صاحب کو دہلی بلوا بھیجا۔ جب مولوی صاحب نے حدود دہلی میں قدم رکھا۔ تو شاہزادی کی حالت دفعۃً رو بصحت ہونے لگی۔ اور جب وہ دہلی پہنچ گئے تو شاہزادی بالکل تندرست ہو گئی یا دوسرے الفاظ میں وہ آسیب چلا گیا۔

بادشاہ نے مولانا کو بہت سا انعام و اکرام عطا فرمایا۔ بہت بڑی جاگیر عطا کی اور مقربان بارگاہ شاہی میں داخل فرمایا۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے جو ہر چند پہلی وجہ کی نسبت کسی قدر زیادہ وزن

دار نظر آتی ہے۔ مگر واقعات اس کے بھی خلاف ہیں۔ جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب نواب سعد اللہ خاں شاہجہان کے وزیر ہو گئے تو انہیں اپنا عالم و فاضل ہم مکتب ملا عبد الحکیم یاد آیا۔ اور انہوں نے اس کو دہلی بلا لیا۔

اگر یہ وجہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا عبد الحکیم ۱۰۵۲ھ کے بعد شاہجہاں کے دربار میں پہنچے ہیں اس لیے کہ نواب سعد اللہ خاں رمضان ۱۰۵۰ھ میں معقول تنخواہ پر شاہجہان کے پاس ملازم ہوئے ہیں۔ اور چارہی سال کے عرصہ میں قابلیت کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قلمدان وزارت بغیر کسی کوشش کے آپ کے قبضہ میں آ گیا ہے۔

دربار میں پہنچنے کے لیے کسی ایسے تحفہ کی ضرورت تھی جو ان کی قابلیت و علمیت کا اظہار کرتی۔ شاعر نہیں تھے کہ قصیدہ لجاتے۔ تاجر نہیں تھے کہ کوئی مال پیش کرتے مگر نہیں تھے کہ جھوٹی سچی خبروں سے اپنی مطلب براری میں کامیاب ہو جاتے۔ عالم تھے۔ علم کے کیڑے تھے۔ ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں ایک کتاب لکھی جو مختصر تھی لیکن نہایت مدلل اور جامع۔ نام اس کتاب کا درشمینہ (ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی پیرسٹریٹ لاء لاہور متوطن سیالکوٹ کا بیان ہے کہ عرصہ ہوا۔ اس مختصر سی کتاب کا میں نے ایک قلمی نسخہ کسی کے پاس دیکھا تھا) بیان کیا جاتا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں کی معرفت شہنشاہ کے حضور میں وہ مختصر سی کتاب پیش کی۔ بادشاہ نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور وہ قدر دانی اور علم نوازی فرمائی کہ چٹائیوں پر بیٹھنے والے سونے چادی کے سکوں سے تولے گئے۔

ان روایتوں کی جب واقعات سے تطبیق کی جاتی ہے تو ہمیں ان کی صحت سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مولانا کے پاس ایک جن بشل انسان پڑھتا رہا ہو۔ اس لئے کہ نہ عالم جنات سے انکار ہے اور نہ اس بات سے کہ ان میں بھی بڑے بھلے۔ نیک بد اور عالم و جاہل ہوتے ہیں۔ مگر مولانا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے جو مرتبہ علمائے عصر میں

رکھتے تھے اور خود دربار جہانگیر میں جوان کی وقعت تھی۔ وہ تعویذ دھاگہ۔ عالم و معمول اور افسوں اور ٹونکوں کی وجہ سے نہ تھی۔ مولانا لاہور کی سرکاری اعلیٰ مدرسہ کے صدر (پرنسپل) تھے۔ ملک میں ان کی عظمت و شہرت کا چرچا تھا۔ جہانگیر جب لاہور آتا تھا۔ تو مولانا ضرور دربار میں بلوائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ عالم فاضل تھے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ جاگیر دار تھے۔ شاہجہان ضرور ان کے نام اور کام سے آگاہ تھا۔ تعارف کے لئے کسی جن یا عمل و افسوں کی ضرورت نہ تھی۔ جب شاہجہان نے بادشاہ ہو کر علماء و شعراء کی ایک فہرست انعام و اکرام عطا کرنے کے لئے مرتب کرائی تو مولانا کا نام بھی اس فہرست میں تھا۔ چنانچہ صاحب ”آثار خیر“ ملا عبد الحمید (ملا عبد الحمید لاہور کو بھی چند مرتبہ انعامات ملے ہیں۔ ایک مرتبہ کے انعام کی رقم تین ہزار روپیہ بتائی گئی ہے۔) لاہوری کے شاہجہان نامہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ جن علماء کو سال جلوس اول یا بعد کے سالہائے جلوس میں انعام و اکرام ملتے رہے ہیں ان میں ایک ملا عبد الحکیم فاضل سیالکوٹی بھی تھے۔ اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ انعام کی مقدار بارہ بارہ ہزار روپیہ ہوئی تھی۔

صاحب مآثر الکرام دفتر اول میں مولانا عبد الحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”چوں نوبت دارائے ہندوستان بہ صاحب قران شاہجہان انار اللہ برہانہ رسید۔ و طائفہ علماء و شعراء رارواجے دیگر پدید آمد۔ ملا عبد الحکیم دریں عہد بارہا خود را بہ درگاہ خلافت رسانید۔ ہر گاہ وارد حضور میگرددید۔ بہ رعایت نقودہ نامحدود مخصوص مے گشت و دو بار از سنجیدہ شد و میانع ہم سنگ ہم گرفت۔ چند قریہ بہ رسم سیورغال انعام شد“

مندرجہ بالا سطور سے نہ صرف یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولانا عبد الحکیم کو دربار شاہجہان میں رسائی کے لئے کسی جن کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ ان کا علم و فضل ان کا کافی ذریعہ تھا۔ اور ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ ان کی بیحد قدر و منزلت کرتا تھا۔

دوسری وجہ نواب سعد اللہ خاں کی سفارش بتائی جاتی ہے۔ ہم اس پر بھی واقعات کے لحاظ سے ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

شاہجہان ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ مطابق ۶ فروری ۱۶۲۸ء کو تخت پر بیٹھا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں رمضان ۱۰۵۰ھ میں اس کے پاس آیا ہے۔ اور ۱۰۵۴ھ میں اس کو قلمدان وزارت ملا ہے۔ ”آثار خیر“ مآثر الکرام“ اور ”شاہجہان نامہ“ کی تحریریں ہم کو بتا چکی ہیں کہ شاہجہان نے ابتدائے سلطنت ہی میں انعام و اکرام اور عطایات کے دروازے مولانا عبدالحکیم پر کھول دیئے تھے۔ ان تحریروں کی موجودگی میں یہ بات کسی طرح تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ مولانا عبدالحکیم جو سعد اللہ خاں کے نواب اور وزیر ہونے سے ۱۶-۱۷ سال پیشتر شاہجہان کے دربار میں رسوخ رکھتے تھے۔ سعد اللہ خاں کی سفارش سے شاہجہان کے دربار میں پہنچے ہوں۔ نواب سعد اللہ خاں کا عروج ۱۰۵۴ھ میں شروع ہوتا ہے۔ اور جمادی الآخر ۱۰۶۶ھ ہی سے شاہجہان کے دربار میں رسوخ رکھتے تھے بلکہ شاہجہان کے باپ جہانگیر کے زمانہ میں بھی شاہی دربار میں ان کی آمد و رفت تھی۔ جیسا کہ حضرت میاں میر کی ملاقات کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں عظیم القدر ہم مکتب کچھ مدت تک دربار شاہجہان کے نورتن رہے ہیں۔ نواب سعد اللہ خاں خوبے قسمت اور اپنی اعلیٰ قابلیت سے وزیر ہو گئے۔ اور مولانا علمائے کرام کی صف میں اس ممتاز جگہ پر بیٹھے جو بادشاہ کے پہلو میں نشست گاہ علماء کے نام سے موسوم تھی۔

منطق و فلسفہ کی بحث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ نامی علماء و فضلاء دربار میں جمع تھے۔ وظیفے لیتے تھے۔ ان میں بعض درس و تدریس کا شوق بھی کرتے تھے یہ سب علماء جاگیروں کے مالک بھی تھے۔ اور سب ”فاضل سیالکوٹی“ کا ادب و احترام کرتے تھے۔

خود شہنشاہ نے کئی گاؤں جاگیر میں دیئے۔ اور ہمیشہ انعام اکرام سے مالا مال کیا۔

شاہجہانی عہد میں جو نامور اور ذی علم علماء درجہ امراء میں داخل تھے اور جن میں بعض (مثلاً نواب سعد اللہ خاں) (روضہ قیومیہ میں لکھا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں علم و فضل میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے مگر کاروبار ملکی کی وجہ سے ان کے علم کا ظہور علماء کی مجلسوں میں نہیں ہوتا تھا۔) ملکی خدمات پر بھی مامور تھے۔ مصنف آثار خیر نے ان کی تعداد بائیس تک بیان کی ہے۔ جن میں بدخستانی بھی ہیں۔ بخاری اور سندھی بھی ہیں۔ اور لاہور۔ کابل اور دہلی کے رہنے والے بھی ہیں۔ انہی میں ”ملا عبد الحکیم سیالکوٹی“ کا نام بھی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہ علماء و فضلاء ملکی کام بھی کرتے تھے۔ غیر ممالک کے بادشاہوں اور ماتحت والیان ملک کو حفظ مراتب کے ساتھ حکومت کی طرف سے مراسلے لکھتے تھے۔ شریعت اسلامیہ اور علم دین کی حفاظت و اشاعت کرتے تھے۔ ایسے ہی عالمان دین کے فیضان صحبت کا یہ اثر تھا کہ شاہجہان نے بادشاہ ہو کر کئی نامشروع امور مثلاً سجدہ۔ کورنش وغیرہ ترک کر دیئے۔

روضۃ الادبا میں لکھا ہے کہ ”فاضل سیالکوٹی“ کچھ عرصہ تک شاہزادوں کو بھی تعلیم و تربیت دیتے رہے ہیں۔ اور جہانگیر اور شاہجہان آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شاہجہان علم کا بڑا حامی اور اہل علم کا بڑا قدر دان تھا۔ شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ شاہجہان نے اپنے سال جلوس میں علماء فضلاء اور دیگر ارباب استحقاق کو جو جاگیریں عطا کریں وہ ایک سو بیس گاؤں اور چار لاکھ بیگہ زمین پر مشتمل تھیں۔ زر نقد جس کی تعداد لاکھوں تک ہوتی تھی۔ جاگیروں کے علاوہ ہوتا تھا۔

شاہجہان کی علم دوستی و علم پروری یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس نے اپنے ایام سلطنت میں تیرہ اہل کمال کو جن میں دو ہندو۔ دو جراح اور باقی شعراء مؤرخ اور علماء تھے سونے چاندی سے تلوا یا۔

شاہجہان نے دو مرتبہ مولانا عبدالحکیم کا تلامذہ کر لیا ہے۔ مآثر الامراء اور دیگر کتابوں میں لکھا ہے کہ مولانا کو دونوں مرتبہ چھ چھ ہزار روپیہ نقد ملا۔ جوان کے وزن کے برابر تھا۔ رائج الوقت ایک ہزار سکہ (ایک روپیہ کا وزن ایک تولہ کے برابر) کا وزن ساڑھے بارہ سیر ہے۔ چھ ہزار روپے کا وزن ایک من ۳۵ سیر ہے۔ اگر شاہجہانی سکہ کو موجودہ رائج الوقت (انگریزی) سکہ سے کم و بیش سمجھا جائے تو چھ ہزار روپے کا وزن پھر بھی دو من کے اندر ہی رہتا ہے۔ اس حساب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اچھی جسامت کے تھے۔ اور ان کی صحت باوجود کثرت مطالعہ اور شغل تدریس کے خراب نہ تھی۔ حدائق الخفیہ میں مولانا عبدالحکیم کے حدلات میں لکھا ہے کہ (بزمانہ شاہجہان) ان کے پاس ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی، جو آپ کی اولاد کے پاس چند پشتوں تک موجود رہی۔ مگر بعد میں گھٹتے گھٹتے بعد سرکار انگلشیہ بالکل معدوم ہو گئی۔

مولوی عبدالحکیم کے تلامذہ

مولوی عبدالحکیم علوم معقول و منقول۔ منطق و فلسفہ اور دینیات کا وہ مجمع البحرین تھے کہ جن کے چشمہ فیض سے سینکڑوں اور ہزاروں تشنگان علم نے پیاس بجھائی لیکن آج جب مولانا کے فیض یافتگان اور تلامذہ کے نام تلاش کئے جاتے ہیں تو سوائے مآثر الکرام جلد اول کے کہیں اور کسی جگہ کوئی نام نہیں ملتا۔

مآثر الکرام میں چونکہ زیادہ تر بلگرام (لکھنؤ) کے علماء و فضلاء کا ذکر ہے اس لئے اس میں مولانا کے جن دو شاگردوں کا نام ملا ہے وہ بلگرام اور اسی نواح کے بزرگ ہیں اور ممکن ہے انہوں نے مولانا سے اس زمانہ میں تعلیم پائی ہو جب شاہجہان کے ابتدائی دور میں وہ لاہور سے اکبر آباد کے سرکاری مدرسہ میں بھیجے گئے تھے۔ کیونکہ اکبر آباد (آگرہ) بہ نسبت لاہور کے بلگرام اور اس کے نواح سے بہت نزدیک ہے۔

مولانا نے لاہور اور سیالکوٹ میں بھی سرکاری اور پرائیویٹ طور پر سلسلہ تدریس جاری رکھا ہے۔ جہاں دُور دُور سے لوگ پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اور چونکہ پنجاب کے گھر میں علم کی یہ گنگا بہ رہی تھی اس لیے اہل پنجاب کو یقیناً ان کی ذات سے فیض عظیم پہنچا ہوگا۔ لیکن تعجب ہے کہ پنجاب میں ان کے کسی ایک شاگرد کا نام کسی تاریخ یا کسی کتاب میں جو راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہے نظر سے نہیں گذر سکا۔

بہر حال مآثر الکرام سے جن دو شاگردوں کا پتہ مل سکا ہے اُن کا ذکر ذیل میں درج ہے۔

ملا عبد الرحیم

مولوی صاحب سے عرصہ تک پڑھتے رہے۔ بعد فراغِ تعلیم مراد آباد کے قاضی ہو گئے۔ وطن بھی سنبل (ضلع مراد آباد) کے قریب ہی تھے۔ سید سعد اللہ بلگرامی جن کا مزار گجرات (دکن) میں ہے اور جو فقر و فضل میں عالی مرتبت تھے انہی ملا عبد الرحیم کے شاگرد تھے۔

میر سید اسماعیل بلگرامی

ابتدائی علوم ملا عبد السلام (مولوی عبد السلام دیوہ اپنے ہمنام ملا عبد السلام لاہوری کے درس لاہور میں ایک عرصہ تک پڑھتے رہے۔ شاہجہان نے ان کو فوج کا قاضی بنا دیا تھا۔ لیکن آخر عمر میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور میں انتقال فرمایا۔) دیوہ (ضلع بارہ بنکی) سے حاصل کئے۔ ہندی علم موسیقی سے خوب واقف تھے۔ جب گردونواح سے پیاس بجھتی نظر نہ آئی تو مولوی عبد الحکیم کے پاس سیالکوٹ چلے آئے۔ جن کی شہرت ان کے ذاتی کمال علم اور شاہانہ نوازشوں سے دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔

سید بلگرامی نے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے سبق پڑھنے کے لیے علیحدہ وقت دیا جائے۔ مولوی صاحب نے عذر کیا۔ اور فرمایا۔ ہجوم طلباء کے سبب علیحدہ وقت دینے کی گنجائش و فرصت نہیں ہے۔ مگر تم فلاں طالب علم کے ساتھ سماعت سبق

اختیار کر سکتے ہو۔ میر صاحب نے اس خیال سے کہ وقت ضائع نہ ہو۔ سماعت سبق کو قبول کیا۔ مگر اس طریقہ سے کہ سماعت کا پورا حق ادا کر دیا ہے یعنی جب ان کا ساتھی طالب علم سبق لیتا تو آپ سننے رہتے اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولتے گویا ”سماعت“ پر پورا عمل کر رہے تھے۔ اسی طرح ایک مدت گذر گئی۔ یہاں تک کہ خود مولوی صاحب نے ایک دن فرمایا کہ تم نے تو اتنے عرصہ میں کبھی ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا۔ میر صاحب نے کہا۔ مجھے سبق کے لئے علیحدہ وقت نہیں ملتا۔ اور دوسرے کے سبق میں سوائے سننے اور خاموش رہنے کے میرا کوئی منصب بولنے کا نہیں ہے۔ اگر علیحدہ وقت فقیر کو عنایت ہو۔ تو اپنی استعداد کے اندازہ کے موافق کچھ حاصل کر سکوں گا۔ ورنہ اسی طرح ناکام چلا جاؤں گا۔

مولوی صاحب نے فرمایا۔ عصر اور مغرب کے درمیان جو وقت ہے وہ میں تمہاری نذر کرتا ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن میر صاحب کا درس مستقل طور پر علیحدہ شروع ہو گیا۔ ایک دن دوران سبق میں گفتگو اور بحث اس حد تک پہنچی کہ شام کی نماز کا وقت آ گیا چنانچہ نماز پڑھ کر پھر درس اور بحث میں مشغول ہو گئے۔ اور اس بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ عشاء کی نماز تک گفتگو بحال رہی۔ مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ اس مسئلہ پر بڑھی بحث ہو چکی ہے۔ اور ابھی سررشتہ سخن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو فرمایا۔ کل صبح اول وقت آؤ۔ تمام طلباء کا درس موقوف و بند کر کے سارا وقت اسی مسئلہ اور اسی بحث کو دیا جائے گا۔ دوسرے دن سید صاحب صبح ہی حاضر ہوئے۔ اور دوپہر تک بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ غرض تین دن تک اسی طرح بحث ہوتی رہی۔ لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ (افسوس ہے کہ صاحب مآثر الکرام نے اس مسئلہ کا نام نہیں لکھا۔ جس پر اس قدر طویل بحث جاری رہی منطق و فلسفہ کے خدا جانے کیا کیا نکات تھے جو زیر بحث رہے۔) آخر مولوی صاحب نے سید صاحب سے کہا۔ آخر اس مقام کا حل تم پر بھی کسی طرح ظاہر ہوا ہے یا

نہیں۔ میر صاحب نے کہا ایک محشی نے اس کا حاشیہ لکھا ہے۔ اور یہ کہہ کر میر صاحب نے جو حاشیہ خود لکھا تھا۔ نکال کر پیش کیا۔ مولوی صاحب نے پڑھا۔ اور بے ساختہ ان کے ذہن رسا کی داد دی۔ اور تحسین کے جواہر نثار کئے۔ اور فرمایا۔ حاشیہ کا مطلب بہت دقیق اور نازک ہے۔ مگر عبارت طوالت سے خالی نہیں ہے۔ پوچھا۔ اب تک کہاں پڑھتے رہے؟ کہا ملا عبدالسلام صاحب دیوہ سے۔ مولوی صاحب کو خیال گذرا کہ مولوی عبدالسلام نے شاید میرا امتحان لینے کے لیے سید صاحب کو بھیجا ہے اس خیال کو سید صاحب سے برملا ظاہر کر دیا سید صاحب نے قسم کھائی کہ مولوی عبدالسلام کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ محض بغرض استفادہ بطور خود حاضر خدمت ہوا ہوں۔

اس واقعہ کے بعد میر صاحب کی عزت مولانا عبدالحکیم کے دل میں بہت زیادہ ہو گئی میر صاحب ایک عرصہ تک مولوی صاحب کے درس میں شامل رہے۔ اور بقیہ کتابوں کی تحصیل کر کے اور فاتحہ فراغ (فاتح فراغ زمانہ قدیم میں ایک رسم تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ جب طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتا تھا تو استاد دیگر طلباء کے مجمع میں فارغ التحصیل طلباء کو چند نصیحتیں کرتا تھا اور دعائے خیر کر کے اس کو رخصت کیا جاتا۔) لیکر اپنے وطن کو واپس گئے۔

میر صاحب۔ صاحب قلم ہی نہیں تھے۔ بلکہ صاحب شمشیر بھی تھے۔ نواب نجابت خاں نے ایک مرتبہ آپ کی شجاعت دیکھ کر کہا تھا ”سید صاحب السیف والقلم است“ نواب نجابت خاں کے مصاحبوں میں تھے۔ آخر عمر میں ملازمت ترک کر دی۔ اور پھر مرتے دم تک تدریس و تصنیف کا شغل جاری رکھا۔ مولوی عبدالحکیم کے انتقال کے بیس سال بعد اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۸۸ھ میں اپنے وطن بلگرام میں پیوند خاک ہو گئے۔

مولوی عبدالحکیم اور شیخ آدم بنوری

حضرت شیخ آدم بنوری (بنورسہند سے دس بارہ کوس کے فاصلہ پر ایک مقام ہے۔) حضرت مجدد الف ثانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو تمام خلفاء سے افضل جانتے تھے۔ لاہور میں اُن کا ایک مخلص تھا۔ اس نے شیخ صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب پانچ ہزار ارادتمند پٹھانوں کی ایک جماعت کے ساتھ سرہند کے رستے لاہور آئے۔ یہاں بے شمار لوگ آپ کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ بلکہ افغانستان سے صد ہا آدمی آپ کی زیارت کے لئے لاہور آتے۔ جب تک آپ لاہور رہے۔ لاہور میں اسقدر رونق تھی کہ بقول صاحب روضہ قیومیہ گلی کو چوں میں سے چلنا مشکل تھا۔

یہ واقعہ ۱۰۵۵ھ (مورخہ ۲۹ شوال کو نور جہاں نے لاہور میں انتقال کیا۔ شاہجہان اس وقت خود لاہور موجود تھا۔ بڑے اعزاز سے اُس کو اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں جس کے گرد چار چمن تھے دفن کیا، اسی سال پنجاب میں سخت قحط پڑا امساک باراں اور افواج شاہی کی گردادری (تسخیر بلخ و بدخشاں سے غلہ قدر گراں ہو گیا کہ آدمی اپنے فرزندوں کو بیچتے ہی نہیں تھے بلکہ ذبح کر کے کھا جاتے تھے۔ بادشاہ نے متفرقات و مفصلات کے علاوہ لاہور میں دس لنگرخانے قائم کئے۔ ہر لنگرخانہ میں دو سو روپیہ کی خوراک پختہ و خام تقسیم ہوتی تھی۔ پچاس ہزار روپیہ بے بضاعت سفید پوشوں کو دیا۔ اور حکم دیا کہ جو بچے فروخت کئے جا چکے ہیں ان کا زر سرکار سے ادا کر کے وہ اپنے والدین کے پاس پہنچائے جائیں۔) کا ہے جبکہ شاہجہان کشمیر سے واپسی کے وقت وسط رمضان میں لاہور پہنچا تھا۔ اس سفر میں بادشاہ نے پانچ مہینے تک لاہور میں قیام کیا۔ اور ۱۸ صفر کو یہاں سے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ جب بادشاہ نے سنا کہ لاہور میں ایک ایسا شیخ آیا ہے

جس کے گرد ہزار ہا لوگ جمع رہتے ہیں اور جس کے دم قدم سے لاہور میں وہ رونق ہے کہ بازاروں اور گلی کوچوں میں چلنا محال ہو رہا ہے تو اس سے ملاقات کرنے کے لئے وزیر سعد اللہ خان سے مشورہ کیا۔ اس وقت مولوی عبد الحکیم کہ ان کو ملک العلماء (روضہ قیومیہ در بیان خلفائے عظام و مریدان کرام حضرت مجدد الف ثانی) بھی کہتے تھے موجود تھے۔ تجویز یہ قرار پائی کہ علامہ دستور المعظم اور ملک العلماء پہلے شیخ صاحب سے جا کر ملیں۔ اگر شیخ صاحب میں کچھ جوہر نظر آئے تو پھر بادشاہ بھی اس سے ملاقات کرے۔

جب دونوں جلیل القدر عالم شیخ صاحب کے پاس آئے اس وقت شیخ خلوت میں تھے۔ انہوں نے اطلاع کی مگر شیخ نے اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ آخر دونوں خلوتخانہ سے باہر خانقاہ کے اندر بیٹھے رہے۔ کافی دیر کے بعد شیخ جب خلوت سے باہر نکلے پھر بھی ان کی چنداں پرواہ نہ کی۔ ملک العلماء اور وزیر دونوں جید عالم تھے۔ کسی نہ کسی طریق سے انہوں نے علمی مباحثہ شروع کر دیا۔ حضرت شیخ اول تو ان کی باتوں کو سنتے ہی نہ تھے۔ اور سنتے بھی تھے تو جواب اور کا اور دیتے تھے۔

مولوی صاحب نے بحث ترک کر کے حضرت مجدد الف ثانی کے بعض معارف جو علم کلام کے متعلق تھے۔ اور حضرت کے چند اجتہاد یہ مسائل کی تشریح شیخ صاحب سے دریافت کی۔ شیخ نے حضرت مجدد صاحب کے صرف دو تین تصرفات اور ان کے بزرگانہ فضائل کا ذکر کر کے دقیق باتوں کا جواب کسی اور وقت پر ٹال دیا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب نے ان حقائق و معارف کی تحقیق خود ہی بیان کی۔ جس پر تمام لوگ عیش عیش کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے کہا شیخ صاحب! جہاں سے آپ کو یہ کمالات حاصل ہوئے ہیں میں نے بھی اسی بارگاہ سے کسب سلوک کیا ہے۔ میں تو آپ کو اپنی جنس (یعنی پیر بھائی) سمجھ کر آیا تھا۔ ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی۔

غرض مولوی صاحب اور وزیر سعد اللہ خاں دونوں وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب تو خاموش رہے مگر وزیر نے کہا۔ یہ جاہل ہے پٹھان اس نے بہت جمع کر رکھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہیں فتنہ و فساد برپا کرے۔ بادشاہ نے شیخ کو کوئی تکلیف تو نہ دی۔ لیکن حج کے بہانے اسے ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ چنانچہ شیخ آدم بنوری کا انتقال مدینہ ہی میں ہوا ہے۔

مولوی عبدالحکیم اور حافظ شیخ حسین

شیخ حسین ”ڈاڈا“ قرآن شریف کا حافظ تھا۔ اور اپنے کمال علم کی وجہ سے آیات اللہ کے عجیب و غریب معانی بیان کرتا تھا۔ اس کا قول تھا۔ نہ مقیم ہوں نہ مسافر۔ نہ مسلمان نہ کافر الان کما کان (اب بھی ویسا ہی ہوں جیسا پہلے تھا) لاہور میں ڈاڑھی منڈا کر مست پھرتا تھا۔ اس کے مرید بھی سب ڈاڑھی منڈے تھے۔ سماع و مزامیر اور گانے بجانے میں رات دن محو رہتا تھا۔ اس کے طریقہ ملامتیہ کی وجہ سے قاضی القضاة مخدوم الملک نے اس کو سزا دینی چاہی۔ مخدوم الملک ایک دن گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ شیخ نے اس کو دیکھ لیا۔ اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہنے لگا۔ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ توحید میں میں اور تم دونوں شریک۔ حج زکوٰۃ کو تم نے چھوڑا نماز روزہ میں نے ترک کیا۔ پھر میں تنہا کس طرح سزا کا مستحق ہوں؟ مخدوم الملک اس کا کچھ جواب نہ دے سکا اور چلا گیا۔ ایک دن مولانا عبدالحکیم (حسانات العارفين یعنی شطحات از تصنیف داراشکوہ۔ سال تصنیف ربیع الاول ۱۰۶۳ھ۔) بھی شیخ کے پاس گئے۔ اور کہا۔ میں مرید ہونا چاہتا ہوں۔ شیخ نے کہا۔ کیوں مجھے رسوا کرنا چاہتے ہو۔ تم اس کام کے نہیں ہو۔ اور نہ میری شرائط پوری کر سکتے ہو (یعنی تم کو ڈاڑھی منڈانا ہوگی اور پیالہ (شراب کا) میرے ہاتھ سے پینا ہوگا) مولانا نے کہا اگر دلیل و برہان سے قائل کر لو گے تو جو کہو گے ماننے کو حاضر ہوں۔ شیخ نے کہا۔ جاؤ تم خشک

ملا میرے مطلب کے نہیں ہو۔ شہزادہ داراشکوہ نے حسان العارفین میں شیخ کی ان خوارق عادات اور کرامات کا ذکر کیا ہے جو مولانا کی چشم دید تھیں یا لوگوں نے بیان کی تھیں۔

مولوی عبدالحکیم کا کتب خانہ

مولانا عبدالحکیم کے علم و فضل اور ان کی علمی شہرت و قابلیت کے اندازہ سے ان کے نادر کتب خانہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ وہ خود مصنف تھے۔ صاحب علم تھے۔ طالب علم تھے۔ صاحب درس و تدریس تھے۔ کتابوں ہی میں پلے۔ کتابوں ہی میں پرورش پائی۔ امیر بلکہ امیر الامراء تھے۔ پھر کتابیں انبار و رانبار ان کے پاس نہ ہوتیں تو اور کس کے پاس ہوتیں؟ خدا جانے منطق و فلسفہ۔ فقہ و حدیث۔ علم کلام و تفسیر اور نحو و الہیات کے کیا کچھ بیش بہا خزانے تھے۔ اور ان کے علاوہ کیا معلوم ہے کس کس علوم و فنون کا ذخیرہ تھا جس کا آج وجود تک بھی نہیں۔

افسوس خلف وہ نہ نکلے جو سلف تھے۔ سلف بنانے کے لئے آئے تھے۔ خلف برباد کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ وہ کتب خانہ نااہلوں کے پاس آ کر رفتہ رفتہ تباہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سکھوں کے زمانہ میں جب سیالکوٹ لوٹا گیا۔ شہر میں آگ لگائی گئی تو مولوی عبدالحکیم کا نادر کتب خانہ بھی جو اپنے زمانہ میں شمالی ہند کا لا جواب دارالکتب تھا۔ سکھوں نے جلا دیا۔ (اقتباس از خط شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی۔)

علامہ عبدالحکیم کی وفات اور ان کا مقبرہ

مولوی عبدالحکیم کے دو نامور ہم مکتبوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان میں عمر میں سب سے چھوٹے مگر شہرت و عظمت میں سب سے بالا و بزرگ تر حضرت مجدد الف ثانیؒ ۱۰۳۲ھ میں کہ ابھی جہانگیر ہی کا عہد تھا۔ اور سعد اللہ خاں ابھی ملا سعد اللہ لاہوری ہی کے نام سے مشہور تھا۔ انتقال فرما گئے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور علامہ عبدالحکیم میں جو علمی و روحانی بلکہ پیری و مریدی کے تعلقات تھے۔ وہ بعنوان ”علامہ عبدالحکیم کے ہم مکتب“ ظاہر کیئے جا چکے ہیں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی حسرتناک وفات سے جو رنج مولانا کو ہوا ہوگا اس کا اندازہ ان تعلقات کی بنا پر خود ناظرین لگا سکتے ہیں۔

مولانا عبدالحکیم کے دوسرے ہم مکتب نواب سعد اللہ خاں تھے۔ جنہوں نے گیارہ سال کی وزارت عظمیٰ کے بعد بارہویں سال جمادی الآخر ۱۰۶۶ھ میں شاہجہان کی معزولی سے دو سال پیشتر انتقال کیا۔

۱۰۶۸ھ ۲۱ رمضان کو عالمگیر نے اپنے باپ اور مولانا عبدالحکیم کے حقیقی قدردان اور سرپرست شاہجہان کو قید و معزول کر کے بادشاہی تاج اپنے سر پر رکھا۔

علاوہ ازیں تین سلطنتوں کا انقلاب کچھ تھوڑی بات نہ تھا۔ اور پھر یہ وہ سلطنتیں تھیں جن کی مدت ایک سو سال سے کم نہ تھیں۔ اور جو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا سنہری عہد کہلاتی ہیں۔ جہانگیر کی اپنے باپ سے بغاوت! پھر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں اس کے بیٹے خسرو کا فتنہ و فساد۔ اور آخر اس کا قید کی حالت ہی میں مرجانا۔ جہانگیر کی شاہجہان سے ناراضگی۔ اور کشمیر کے رستہ میں بادشاہ کا انتقال۔ شاہجہان کی تخت نشینی اور لاہور میں پانچ شہزادوں کا ایک ہی دن آصف جاہ کے ایما سے قتل ہونا۔ پھر شاہجہان کی آخر عمر میں اس کے چاروں بیٹوں کی باہم خانہ جنگیاں۔ بادشاہ کا قید ہونا۔ اور اس کے تینوں بیٹوں کا مچھلے بیٹے عالمگیر کے ہاتھوں قتل و آوارہ ہونا۔ یہ ایسی باتیں نہ تھیں کہ مولانا عبدالحکیم ان سے متاثر نہ ہوتے۔ اور پھر ۹۶۸ھ کی پیدائش کے مطابق ۱۰۶۸ھ میں جبکہ ان کی عمر بھی ایک سو سال کی ہو چکی تھی۔ اور ان کے رفیق بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کا اپنا حال اس شعر کے مطابق تھا۔

ہوش و حواس و عقل و خرد جا چکے ہیں سب اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مولانا عبدالحکیم کے سال پیدائش کا معیار صرف تاریخی قیاسات پر قائم کیا گیا ہے لیکن ان کے سال وفات ۱۰۶۸ھ میں سب مورخوں (میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے۔ مولانا عبدالحکیم ۱۲ ربیع الاول ۷۰۶ھ کو انتقال کر گئے۔ اس حساب سے ان کا انتقال شاہجہان کی نظر بندی و معزولی سے ۶ ماہ پہلے ہوا ہے۔ مگر باقی تمام تذکروں میں سال وفات ۱۰۶۸ھ درج ہے۔ اس لیے ہم نے بھی اس سند کو زیادہ قابل وثوق قرار دیا ہے۔) کا اتفاق ہے۔ مولانا عبدالحکیم اکبر کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اسی بادشاہ کے طویل زمانہ میں انہوں نے کمال علم مولانا کمال سے حاصل کیا۔ جہانگیر کے عہد میں دربار شاہی تک رسائی ہوئی جہانگیر کی مصاحبت میں بیٹھے۔ جاگیر حاصل کی۔ شاہجہان کے وقت انتہائی ترقی حاصل کی۔ اور مختلف اوقات میں ان کا تلامذان ہوتا رہا۔ تینوں بادشاہوں کا طویل عہد۔ اور اس عہد میں مولانا عبدالحکیم کی زندگی کا ثبوت اس بات کی علامت ہے کہ ان کی عمر اگر پورے سو سال کی نہ بھی تھی۔ تو بھی اس قدر طویل ضرور تھی کہ انہوں نے متذکرہ صدر تینوں جلیل القدر بادشاہوں کے عہد حکومت دیکھے ہیں۔

تاریخ سیالکوٹ صدی میں مولانا عبدالحکیم کی وفات کے دو تاریخی قطعات بھی نظر

سے گذرے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

شہ معدن علم۔ عبدالحکیم

ولی مخزن علم عبدالحکیم

۱۰۶۸ھ

بحکم ازل چوں بہ جنت رسید

ندا شد ز دل سال ترحیل او

دیگر

حکیم آں عالم دیں با مروت

دوبارہ متقی اجلال جنت

۱۰۶۸ھ

چو با حکم خدا داخل جنان شد

بخواں عارف بہشتی ارتحالش

وفات مولانا کی سیالکوٹ میں ہوئی۔ اور اپنے عالیشان باغ میں دفن کیے گئے۔
مولانا کے مزار کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سنگ مرمر اور دیگر اقسام کے
بیش قیمت پتھر فرشوں۔ دیواروں۔ محرابوں اور قبر کے تعویذ پر لگائے گئے۔ تاریخ سیالکوٹ
میں لکھا ہے اس طرز و شان کی عمارت سیالکوٹ میں بہت کم تھیں۔

مولانا کے تالاب اور سرکاری ہسپتال (یہاں مولانا کا حمام و مسافر خانہ تھا جس
کا ذکر مولوی صاحب کی تعمیرات کے ذکر میں آئے گا۔) کے درمیان جو سڑک ہے اس کی
دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ کلووال کے پن کو جاتی ہے۔ دوسری وزیر آباد کو۔ دونوں
شاخوں کے درمیان مولانا عبدالحکیم کے مقبرہ کی چار دیواری نظر آتی ہے۔ جس کے
گرد و پیش بھی چند پرانی اور نئی قبروں کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

چار دیواری پختہ ہے مگر اس کس مہر سی میں دستبرد زمانہ سے وہ کب تک محفوظ رہ
سکتی ہے۔ قبر کا چبوترہ چھوٹی چھوٹی چند سیڑھیوں کے بعد آتا ہے۔ چبوترہ پر سفید پتھر کی چھوٹی
چھوٹی تختیاں ہیں جن کی درزیں سنگ سیاہ کے خطوط سے اب تک بھی نہایت خوبصورت
معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فرش کا یہ خوبصورت پتھر سنگریزے بن کر اب اکھڑتا جا رہا ہے۔

مولوی عبدالحکیم کی قبر کے پہلو میں ایک اور قبر ہے۔ تاریخ سیالکوٹ صدی میں
لکھا ہے کہ وہ قبر ان کے فرزند مولوی عبداللہ کی ہے۔ یہ دونوں قبریں بلند چبوترہ پر ہیں۔
ایک قبر ان کے سامنے ہی جنوب کی طرف واقع ہے۔ جو پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے جس پر
اوپر نیچے دو مصرعے لکھے ہوئے ہیں جن کے تمام حروف مٹ گئے ہیں۔ صرف آخری الفاظ
دونوں مصرعوں کے ”زیں عالم چرا“ پڑھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مصرعوں کی ردیف
موجود ہے اور قافیہ اتنا تنگ ہوا ہے کہ مٹ گیا ہے۔

ان قبروں کے علاوہ اس احاطہ کے اندر چودہ پندرہ اور قبریں ہیں۔ جن میں سے
کئی ایک درختوں کی جڑوں کے نیچے آ کر بالکل منہدم ہو گئی ہیں۔

قبر بالکل بے سایہ ہے۔ سوائے چار دیواری کے کسی مکان یا عمارت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے سکھا شاہی دور میں جس طرح لاہور کی اسلامی عمارتوں پر زوال آیا ہے اسی طرح سیالکوٹ کی شاہجہانی طرز کی یہ عمارت بھی بے درووں نے اسلامی جاہ و جلال کے آثار سمجھ کر یا سنگ مرمر کے طمع کے لئے مٹا دی ہو گئی۔ لیکن جو لوگ اپنے نہ مٹنے والے کارناموں کی وجہ سے ”ثبت است بر جریدہ عالم“ کا مصداق ہوں وہ جسمانی طور پر نابود ہو جائیں۔ ان کی قبریں مٹا دی جائیں اور عمارتیں گرا دی جائیں۔ لیکن ان کے نام کبھی صفحہ تاریخ سے مٹ سکتے ہیں؟۔

مولانا عبدالحکیم کی اولاد و احفاد

تاریخوں میں مولوی عبدالحکیم کے صرف ایک ہی فرزند مولوی عبداللہ کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ مولوی عبداللہ جس قسم کے نامور اور بے عدیل باپ کے فرزند تھے۔ ویسے ہی قابل اور حقیقی جانشین ثابت ہوئے۔

تاریخ سیالکوٹ میں لکھا ہے۔ سیالکوٹ مولوی عبداللہ کے زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ نمونہ نظر آتا تھا۔ ان کا استفتاء تمام پنجاب میں جاری تھا۔ علوم ظاہری و باطنی میں ادراک کامل رکھتے تھے۔ ”آثار خیر“ میں لکھا ہے مولوی عبداللہ عہد عالمگیری کے نامور اور مشہور علماء میں تھے۔ ”مآثر الامراء“ اور ”روضہ قیومیہ“ میں جو عہد محمد شاہی کی تصانیف ہیں۔ آپ کے علم و فضل اور آپ کے اس رسوخ و اقتدار (دیکھو کتاب ہذا کہ ضمیمہ ”مشاہیر سیالکوٹ“ در بیان مولانا عبداللہ۔) کا ذکر ہے جو عالمگیر کے دربار میں آپ کو حاصل تھا۔ روضہ قیومیہ میں جو حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کے ایک قابل و عالم رکن مولانا خواجہ احسان احمد کی تصنیف ہے۔ لکھا ہے۔ ”آپ ہندوستان کے مشہور عالم تھے۔ آپ کی تصنیفات نہایت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔“

روضہ قیومیہ میں آپ کو حضرت امام معصوم زمانی قیوم ثانی خلف حضرت امام مجدد الف ثانی کا ہم عصر بتایا گیا ہے۔ حضرت قیوم ثانی نے بعہد عالمگیر ۹۷۹ھ میں وفات پائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۹۷۹ھ تک بقید حیات تھے۔ نیز تمام تاریخوں میں آپ کو علمائے عالمگیری میں شامل کیا گیا ہے۔ عالمگیر کی وفات ۲۰ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو ہوئی ہے۔ آپ کا انتقال بھی اسی سنہ میں یا اس سے چند سال پیشتر ہوا ہوگا۔

اس کے بعد اعظم شاہ سے لیکر رفیع الدولہ تک ہندوستان میں ۶ بادشاہوں (اعظم شاہ بن عالمگیر تین ماہ دس یوم۔ بہادر شاہ شاہ عالم بن عالمگیر پانچ سال ۸ یوم۔ معز الدین جہاندار شاہ بن بہادر شاہ گیارہ ماہ پانچ یوم۔ فرخ سیر بن عظیم الشان بن بہادر شاہ تین سال تین ماہ ۱۸ یوم ابوالبرکات بن رفیع الشان بن بہادر شاہ تین ماہ ۹ یوم۔ رفیع الدین بن رفیع الشان بن بہادر شاہ تین ماہ آٹھ یوم۔ کل دس سال ایک ماہ تیرہ یوم۔ از ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ لغایت ۷ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ۔) نے دس سال ایک ماہ تیرہ یوم تک حکومت کی ہے۔ اس زمانہ میں مولوی عبدالحکیم کی اولاد کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ (عہد حکومت ۱۱۳۱ھ لغایت ۱۱۶۱ھ۔) میں کشمیر کی تاریخیں ایک بزرگ مولانا جان محمد کا نام بتاتی ہیں جن کے متعلق لکھا ہے ”از احفاد ملا عبدالحکیم بود۔ اور علومِ صوری از ملا عاقل استفادہ کردہ فاضل دوران شد۔ و بین الاقران ممتاز گشت و شجرہ نسب میں لکھا ہے۔ مولوی جان محمد بن ملا ابوالفتح بن ملا فاضل۔ اس کے آگے سلسلہ درج نہیں ہے۔ شاید ملا فاضل۔ ملا عبد اللہ عالمگیری کے بیٹے ہوں جو ملک العلماء مولوی عبدالحکیم کے فرزند تھے۔

مولوی جان محمد اس خاندان کی یادگار تھے۔ علم و فضل جس کا کئی پشتوں سے ورثہ چلا آتا تھا۔ اس لیے انہوں نے سن بلوغت سے پیشتر ہی مروجہ علوم میں کافی آگاہی حاصل

کر لی تھی۔ زمانہ کی نیرنگیوں سے مجبور ہو کر وہ عین عالم شباب میں نادر شاہ کے خونی حملہ سے کچھ عرصہ پیشتر محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں دہلی پہنچے۔ ہر چند اس رنگیلے بادشاہ کے زمانہ میں ہر چیز یہاں تک کہ سلطنت بھی ”دفتر بے معنی“ سمجھ کر ”غرق مئے ناپ اولیٰ“ ہو جاتی تھی۔ تاہم مولوی عبدالحکیم کے نام کی عزت و شہرت ابھی تک قائم تھی۔ بادشاہ نے کچھ مولوی عبدالحکیم کی عظمت کے لحاظ سے اور کچھ مولوی جان محمد کی ملاقات سے خوش ہو کر بارہ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نادر گردی کے زمانہ میں اور اس کے بعد زوال سلطنت کی وجہ سے ضبط ہو گیا۔

مولوی جان محمد بندش وظیفہ کے بعد کوہستان جموں و کشمیر کی طرف چلے گئے۔ اور سیاحت ہند کرتے ہوئے کابل جا پہنچے۔ جہاں اس وقت تیمور شاہ درانی (۱۱۸۶ھ لغایت ۱۲۰۰ھ) کی حکومت تھی تیمور شاہ نے بڑی خاطر کی۔ اور معقول مشاہرہ مقرر کر دیا۔ آپ تھوڑے دنوں کے بعد کابل سے کشمیر چلے آئے اور آخر عمر تک اسی جگہ تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ اور سری نگر میں کہ کشمیر کا دارالخلافہ ہے وفات پائی۔

مولانا جان محمد کے بیٹے کا نام مولوی محمد الدین تھا۔ سیاہ فارم ہونے کی وجہ سے محمد الدین اسود کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ شیخ محمود تارہ بلی کشمیری کے شاگرد تھے۔ پشاور جا کر تکمیل علوم کی۔ اور ایک عالم میں شہرت پذیر ہوئے۔ جب کشمیری واپس آئے تو ایام حیات درس و تدریس میں بسر کیے۔ تاریخ کبیر کشمیر میں لکھا ہے بڑے پایہ کے عالم تھے۔ اپنے جد معظم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی طرح اکثر کتب تھیلی پر انہوں نے حاشیے لکھے ہیں۔ ۳۰ ربیع الاول ۱۲۲۳ھ کو سری نگر میں انتقال فرما گئے۔

اسی تاریخ میں ایک اور نامور عالم مولوی قطب الدین کا ذکر الفاظ ذیل کے ساتھ آتا ہے۔ ”مولوی قطب الدین فرزند مولوی محی الدین کشمیری وطناً سیالکوٹی کہ از اولاد

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی است در علم ظاہری فرد یکتا بود“ مولوی قطب الدین ”اوضح الدلائل“
فی جواب خمسہ مسائل۔ ”تحفۃ الہند“ اور ”ہلال عید“ وغیرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ شیخ احمد
کاشمیری تارہ بلی سے کہ اپنے زمانہ کے نامور عالم فاضل اور واعظ بے بدل تھے۔ آپ کا
اکثر بحث و مناظرہ رہتا تھا۔ کشمیر سے امرتسر چلے آئے وہیں انتقال کیا۔ اور مزار فتح بابا
(بیرون شہر) میں مدفون ہوئے۔

ان کے معاصر شیخ احمد تارہ بلی کا انتقال ۱۲۹۰ھ میں ہوا ہے۔ اور مولوی قطب
الدین کے ایک شاگرد مولوی احمد اللہ قاسمی نے ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی ہے۔ اس سے
قیاس ہوتا ہے کہ مولوی قطب الدین بھی اسی زمانہ کے قریب ہوئے ہیں۔

۱۳۱۰ھ کے قریب مولوی عبدالحکیم کی اولاد سے مولوی غلام مصطفیٰ کے نام سے
ایک بزرگ عالم سیالکوٹ محلہ میانہ پورہ میں گذرے ہیں۔ ان کے بعد کشمیر اور سیالکوٹ
میں مولوی عبدالحکیم کے خاندان میں جہاں منطق و فلسفہ کے چشمے بہتے تھے۔ بحث و مناظرہ
سے معلومات علمیہ میں اضافہ ہوتا تھا۔ اور دل و دماغ روشن ہوتے تھے۔ ہو کا عالم نظر آ رہا
ہے مولوی عبدالحکیم کی شہرت ان کے ذاتی کمالات۔ ان کی ذاتی خوبیوں اور ان کی اعلیٰ
تصنیفات کی وجہ سے تھی۔ اس لئے باجود بڑے بڑے انقلابات کے ان کی علمی شہرت و
عظمت اب تک قائم ہے

رہتا ہے ذوق نام سخن سے ابد تک

اولاد سے تو ہے یہی دوپشت چارپشت

مولانا کی اولاد کی دو شاخیں ہیں۔ ایک کشمیر میں اور ایک سیالکوٹ میں۔ سیالکوٹ
کے قبضہ میں بقول صاحب تاریخ سیالکوٹ صرف ایک چاہ مقبرہ والا ہے۔ جس کیساتھ دو تین
گھماؤں اراضی ہے اور ایک دو آم کے درخت سرکار سے بطور معافی ملے ہوئے ہیں۔

مولوی عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عمارتیں

شاہجہان کو تعمیر عمارات کا خاص شوق تھا۔ لاہور۔ آگرہ۔ دہلی۔ کشمیر اور دیگر مقامات پر اب تک عہد شاہجہانی کے کھنڈرات اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ یہ ٹوٹی پھوٹی دیواریں۔ یہ شکستہ عمارات۔ عالیشان محلات و تعمیرات کا نشان ہیں۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پاء کی

بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء و وزراء بھی عالیشان عمارتیں اور باغات تعمیر کرتے تھے نواب سعد اللہ خاں۔ نواب علی مردان خاں۔ نواب وزیر خاں کی اکثر تعمیرات لاہور۔ دہلی وغیرہ میں کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں۔ مولوی عبدالحکیم ہر چند طبقہ علماء میں تھے لیکن حشمت و تمول اور معقول جاگیر کی وجہ سے امراء ذیشان کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے بھی اپنے وطن سیالکوٹ میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جن میں عالیشان ذاتی حویلی کے علاوہ بعض مکانات ایسے بھی تھے جو رفاع عام کے لیے وقف تھے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

مسجد و مدرسہ مولوی عبدالحکیم

یہ عالیشان مسجد بھارت پختہ اب تک موجود ہے۔ اسی میں مولانا عبدالحکیم کا مشہور مدرسہ بھی تھا۔ جس کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اسی مدرسہ سے صدہا طالب علم دستار فضیلت لیکر اور فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے۔ اس زمانہ میں علم بیچا نہیں جاتا تھا۔ اور نہ علم فروشی اور فیس و تنخواہ لینے کی وجہ سے استاد اپنے شاگرد کی نظروں میں اس قدر حقیر سمجھا جاتا تھا۔ مولانا کے مدرسہ میں نادار طلبائے سیالکوٹ کے علاوہ بیرونجات کے مستحق طلباء کو بھی کپڑے کتابیں اور کھانا دارالاقامہ سے ملتا تھا۔

مسجد کے محراب کے اندر حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

تاریخ ہذا۔ المسجد من بانیہ..... لہ البیت فی الجنتہ

دوسرے فقرہ سے بنائے مسجد کا سال ۱۰۵۲ھ نکلتا ہے۔ چونکہ مسجد کے ساتھ ہی مدرسہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سنہ میں آپ نے سیالکوٹ میں اپنا درس بھی جاری کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کا ایک ہم مکتب سعد اللہ خاں بڑھتی دولت کی طرح شاہجہان کے دربار میں عروج حاصل کر رہا تھا۔ اور ابھی وزارت عظمیٰ کا عہدہ اس کو نہیں ملا تھا۔

بنائے مسجد کی یہ تاریخ ہمیں ایک اور واقعہ کا پتہ بھی دیتی ہے۔ یعنی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے لاہور اور آگرہ کی سرکاری ملازمت ۱۰۵۲ھ سے پہلے ہی ترک کر دی تھی۔ اس لیے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب انہوں نے اپنا درس جاری کر دیا ہے تو پھر سیالکوٹ سے بہت کم باہر نکلے ہیں۔ البتہ جاگیردار یا علمائے دربار کا رکن بلکہ ملک العلماء ہونے کی وجہ سے بادشاہ کی دعوت پر کبھی دہلی اور کبھی لاہور تک چلے جاتے تھے۔

مسجد کی کچھ زمین دروازہ مسجد کے باہر عرصہ دراز سے سفید پڑی ہوئی تھی۔ ایک خیر مجسم بزرگ مستری قادر بخش (مولوی محمد ابراہیم صاحب میر۔ سیالکوٹی کے والد۔) مرحوم کاشمیری نے کمیٹی سے خرید کر مسجد کے نام وقف کر دی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں یہ زمین صحن مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کی گئی (مولوی عبدالحکیم صاحب محافظ دفتر ضلع سیالکوٹ (سکنہ نارووال) نے جو اس مسجد میں نماز جمعہ بھی پڑھاتے ہیں۔ عام چندہ سے مسجد کو بارونق بنایا ہے۔ سنا ہے آپ مسجد میں درس بھی دیتے ہیں۔ صحن میں ایک فوارہ دارحوض تیار ہوا ہے جو پانی سے لبریز رہتا ہے۔ یہ مسجد محلہ میانہ پورہ میں واقع ہے۔ اسی محلہ میں مولانا عبدالحکیم کے رہائشی مکانات بھی تھے۔ جن میں سے اب کسی کا نشان تک بھی نہیں ہے۔ میانہ پنجابی زبان میں مسجد کے ملا کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہاں مدرسہ اور مولانا کی رہائش کی وجہ سے

اکثر طالبان علم اور درویش اور ملا لوگ رہتے تھے اس لیے اس جگہ کا نام ہی میانہ پورہ مشہور ہو گیا۔ اور یہ نام مولانا عبدالحکیم کے زمانہ ہی سے چلا آتا ہے۔

حمام و مسافر خانہ مولوی صاحب

تالاب (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کے متصل ہی مولوی عبدالحکیم نے ایک حمام اور مسافر خانہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ عالیشان عمارتیں جو سیالکوٹ کی عظمت و شہرت کا باعث تھیں۔ ”درو دیوار شکستہ“ کی صورت میں ابتدائے عہد انگریزی تک موجود تھیں۔ ۱۲۷۵ھ میں جس کو آج ۱۳۲۱ھ میں چھیا سٹھ سال کا عرصہ ہوتا ہے سرکار انگریزی نے دیواریں گرا کر اس جگہ شفا خانہ یعنی خیراتی ہسپتال بنا دیا ہے۔ (جو کہ سول ہسپتال کے نام سے مشہور تھا۔ پھر بعد میں شہر سیالکوٹ کی مشہور سماجی ورفا ہی شخصیت الحاج سیٹھ محمد بشیر مرحوم نے اپنی والدہ کے نام سے ہسپتال کی از سر نو جدید طرز پر تعمیر شروع کی اور اس کا نام سردار بیگم ہسپتال اپنی والدہ کے نام پر رکھا۔ اس ہسپتال میں دور جدید کے تقاضوں کے مطابق تمام مشنری اور سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے بعد الحاج سیٹھ محمد بشیر مرحوم نے ہسپتال کے ساتھ دوسرا بلاک اپنے والد شمس مرحوم کے نام سے الشمس بلاک تعمیر کروایا ہے جس میں دل کے امراض کے متعلق تمام سہولیات فراہم کی گئی ہیں تاکہ اہل سیالکوٹ اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ الحاج سیٹھ محمد بشیر مرحوم کے تفصیلی حالات تو مکمل طور پر معلوم نہیں ہو سکے جو کہ درج کیئے جا سکیں مگر ان کے بارے میں عوام الناس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ موصوف نہایت خدا ترس، مشفق اور دیندار تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بے شمار غرباء کی امداد کی، مساجد کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مدارس کی تعمیر اور ترقی میں پیش پیش رہے۔ بلکہ علامہ عبدالحکیم علیہ الرحمہ کی تعمیر کردہ جامع مسجد جو کہ علامہ صاحب کے نام سے ہی مشہور ہے اور شہر کے وسط میں تحصیل بازار میں جامع مسجد علامہ عبدالحکیم علیہ الرحمہ کے نام سے مشہور ہے

اس کی از سر نو تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بیش تر حصہ کی تعمیر کے لیے وافر رقم بھی فراہم کی۔ انشاء اللہ الحاج سیٹھ محمد بشیر صاحب مرحوم کے حالات آئندہ ایڈیشن میں تفصیل کے ساتھ معلوم کر کے درج کر دیئے جائیں گے۔

باغ مولوی صاحب

تالاب سے مغرب کی جانب مولوی عبدالحکیم نے ایک وسیع اور دلکش باغ تعمیر کرایا۔ جس کے چاروں طرف ایک بلند فصیل بعمارت پختہ باغ کی حفاظت کے لیے بنوائی گئی۔ باغ میں ہر قسم کے اشجار شردار موجود تھے۔ سیر و سیاحت کی توہر ایک کو اجازت تھی مگر اثمار شیرین و لذیذ سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ یا مسافر خانہ میں عارضی طور پر قیام کرتے تھے۔

اللہ اکبر۔ کیا زمانہ تھا۔ کیا دن تھے۔ باغ میں نہریں چل رہی ہوں گی۔ ہر کیاری پھولوں سے لدی ہوگی۔ مولانا طالب علموں کے جھرمٹ کے ساتھ باغ میں آتے ہوں گے اور باغ باغ ہوتے ہوں گے۔ باغ کی چار دیواری کے اندر نشست گاہیں ہوں گی۔ چبوترے ہوں گے ہاں بارہ دریاں ہوں گی۔ انہیں سنگ مرمر۔ سنگ سیاہ۔ سنگ زرد۔ سنگ ابری اپنی اپنی بہار دکھاتے ہوں گے۔ افسوس اب نہ باغ ہے نہ فصیل۔ نہ کوئی بارہ دری نہ عمارت ہر روش خاک اڑاتی ہے صبا میرے بعد

راقم الحروف ۱۹۲۰ء میں وہاں گیا۔ ایک دو آدموں کے درخت نظر آئے۔ ایک کنواں جاری تھا۔ اور اس کے ساتھ کچھ مزروعہ اراضی تھی۔ اسی جگہ مولانا کی قبر بھی ہے۔ پوچھا مولانا کا باغ کہاں ہے؟ جواب ملا! یہی باغ ہے جہاں تم کھڑے ہو۔ اور جہاں یہ کھیت نظر آ رہے ہیں۔ انا لله وانا اليه راجعون!

عید گاہ مولوی صاحب

مولوی عبدالحکیم نے ایک عالیشان اور وسیع عید گاہ تعمیر کرائی۔ جس کے چاروں طرف بلند اور چونہ گج عمارت تھی۔ عید گاہ کا دروازہ اور اس کی پیشانی اسی قسم کے نقش و نگار اور خوبصورت بیل بوٹوں سے آراستہ تھی جس طرح لاہور کی مسجد وزیر خاں اور گلابی باغ اور باغ چوبرجی کے دروازوں کی پیشانیاں اب تک منقش نظر آ رہی ہیں۔ عید گاہ کے چاروں دروازوں پر نہایت بلند مینار تھے۔ عید گاہ کا صحن اس قدر وسیع تھا کہ اس میں ہزار ہا آدمی بہ آسانی نماز پڑھ سکتے تھے۔

یہ مرور ایام۔ دیوار اکثر جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ ۱۲۸ھ میں سید وزیر علی ڈپٹی اور میر اسد علی سیالکوٹ میں نائب تحصیلدار تھے۔ انہوں نے کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ شہر کے مسلمانوں سے لیا۔ اور عید گاہ کی مرمت کراوی جو ”ہزار غنیمت“ سمجھی جاتی ہے۔

تالاب مولوی صاحب

مولوی عبدالحکیم غرباء کی مدد کئی طریقوں سے کرتے تھے۔ طالب علموں کا خرچ برداشت کر کے علم جیسی انمول نعمت ان کو بلا قیمت دینا یہ بھی ایک طرح کی بیش قیمت مدد تھی۔ قابل مدد شرفاء کو نقد و جنس کی اعانت سے مالا مال کرتے تھے۔ جب قحط پڑتا تھا اور مفلوک الحالوں کی تعداد حد و حساب سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ تو ان کی مدد معاش کے لیے تعمیرات کا کام جاری کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی بہت سی تعمیرات ان کی فیاضیوں۔ سرچشمیوں اور غربا پروریوں کا ایک بہانہ تھیں۔ انہی میں ان کا وسیع و عمیق اور عالیشان تالاب بھی ہے جو مسجد سے کچھ فاصلہ پر ہے اور جس سے آج تک اہل شہر مستفیض ہو رہے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تالاب لاکھوں روپیہ کی لاگت سے بنا تھا۔ اس میں دریائے چناب سے ایک نہر آتی تھی۔ جس کے مٹے ہوئے نشان اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

مولانا کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب سکھا شاہی دور آیا۔ تو تالاب کی ملحقہ عمارتیں اور برجیاں اور پل مسمار ہو کر زمین کے برابر ہو گئے۔

غدر ۱۸۵۷ء کی شورش میں ہندوستان کے ہر مشہور شہر کو کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا۔ چھاؤنی سیالکوٹ میں بھی ہل چل اور لوٹ مچی۔ مگر پھر بھی بہت بچاؤ رہا۔ البتہ مولوی عبدالحکیم کے تالاب کی سنی گئی۔ جو برسوں سے مسمار و ویران چلا آتا تھا۔

چھاؤنی کے لٹ جانے کی وجہ سے سرکار انگریزی نے بطور سیاست اہل سیالکوٹ پر پچاس ساٹھ ہزار روپیہ جرمانہ کیا جو وصول کر کے داخل خزانہ کیا گیا۔ لیکن جب بعد میں سرکار کو معلوم ہوا کہ فتنہ انگیز اور شورش پسند معدودی چند تھے۔ تمام شہر وفادار اور خیر سگال رہا ہے۔ تو حکم ہوا کہ جرمانہ واپس کر دیا جائے۔ اس زمانہ میں ڈپٹی میر قائم علی (میر نذر الباقر صاحب کوہاٹ اور میر فیض عسکری صاحب پنشنر ڈپٹی سرگودھا آپ ہی کے پوتے ہیں) سیالکوٹ میں اسٹرا اسٹنٹ کمشنر تھے۔ انہوں نے شہر کے معززین اور چوہدریوں کو سمجھایا۔ کہ اگر تم یہ رقم واپس لے لو گے۔ تو کسی کو دو ملیں گے۔ کسی کو چار۔ کسی کو دس۔ اور یہ سب قریباً بیکار جائیں گے۔ لیکن اگر اس روپیہ سے مولوی صاحب والے تالاب کی صفائی اور مرمت کرادی جائے تو اس چشمہ فیض سے سیالکوٹ کے سب لوگ بلا تميز مذہب و ملت مستفیض ہو سکتے ہیں۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور غدر ۱۸۵۷ء کا جرمانہ تالاب کی کھدائی اور مرمت پر خرچ کیا گیا تالاب کے درمیان ایک کنواں تھا۔ اور وہاں تک ایک پختہ بل بنا ہوا تھا۔ مگر مرمت کے وقت وہ پل نکال کر کنواں بند کر دیا گیا۔ تالاب چونکہ شہر سے بالکل ملحق ہے اس لیے سارا دن وہاں عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا ہے۔ تالاب کی غربی جانب میونسپل کمیٹی نے مستورات کے لیے ایک پردہ دار گھاٹ بنا دیا ہے۔

مولوی عبدالحکیم اور علماء مشائخ اور مؤرخین

مولوی عبدالحکیم کا پایہ علم و فضل میں کس قدر بلند تھا۔ اور ان کی علمی شہرت اور علمی زندگی ہندوستان کے علماء و مشائخ اور مؤرخین میں کس عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کے متعلق ہم کو چند تاریخوں کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔

مولانا ابوالفیض کمال الدین شیخ محمد احسان مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی عبدالحکیم کی وفات کے قریباً ایک سو سال کے بعد روضۃ القیومیہ نام ایک کتاب ۱۱۶۴ھ کے قریب لکھی ہے۔ جس میں حضرت مجدد الف ثانی قیوم اول اور ان کے صاحبزادہ نام محمد معصوم قیوم ثانی اور باقی دونوں حضرات قیوم ثالث و قیوم رابع کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ اور وہ خود بھی چونکہ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے وہ کتاب نہایت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ مولانا ابوالفیض روضۃ قیومیہ میں مولانا عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی علمائے وقت کے بادشاہ اور تصانیف عالیہ کے مالک تھے۔ انہوں نے ہر علم میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور تصنیف کی ہے۔ جسے طالب علم تحصیل علم کے آخری درجہ میں پڑھتے ہیں۔ اور انہوں نے ہر ایک کتاب پر حاشیہ لکھا اور شرح کی ہے۔ جس سے طلباء فوائد کثیرہ حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کی شرح اور حواشی بغیر وہ کتاب حل ہی نہیں ہو سکتی۔“

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی جو خود بھی ایک عالم اجل۔ فاضل یکتا۔ مورخ بے نظیر اور اہل اللہ بزرگ محمد شاہ بادشاہ غازی کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ اپنی کتاب مآثر الکرام کے طبقہ علماء میں مولانا عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ علامہ زمان و افتخار زمانیاں است۔ الحق در جمیع فنون درسی مثل اواز زمین ہند نہ بر خاست۔“ اسی قسم کے خیالات میر غلام آزاد بلگرامی نے اپنی عربی تصنیف سنجہ المرجان میں ظاہر کیے ہیں۔ تاریخ سیالکوٹ صدی کا مصنف لکھتا ہے۔ ”اکابر علماء و فضلاء میں ان کا شمار تھا۔ علم کے بحر موج اور خدا

پرستی و دین پروری کے سراج تھے۔“ مولوی محمد الدین لاہوری مولوی فاضل کہ اکثر عربی۔ فارسی اور اردو کتب کے مصنف اور لاہور کے ممتاز علماء میں درجہ اختصاص رکھتے ہیں۔ روضۃ الادباء میں لکھتے ہیں۔ مولانا عبدالحکیم علوم عقلیہ و نقلیہ میں یگانہ زمان اور فہامہ دوران ہوئے ہیں۔ سیالکوٹ ان کا وطن تھا۔ اس لیے فاضل سیالکوٹی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آثار خیر کے مصنف لکھتے ہیں۔ ”ہندوستان کے مشہور علماء فصحاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔“ تاریخ ہندو بست سیالکوٹ کے ہندو مصنف ڈپٹی امین چند لکھتے ہیں۔ ”یہ شخص بڑا عالم فاضل ہوگذا ہے جس کی تصنیفات میں سے کئی کتابیں زبان عربی میں موجود ہیں۔“

مولانا محمد ہاشم جو مولانا عبدالحکیم کے ہم مکتب حضرت مجدد الف ثانی کی ارشد مریدوں میں تھے۔ اپنی کتاب زبدۃ المقامات میں مولانا کے متعلق اپنے وقت کے شیخ المشائخ۔ پیر طریقت۔ واقف رموز شریعت حضرت مجدد الف ثانی کے الفاظ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ ”مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی علوم عقلیہ و نقلیہ میں تصانیف عالیہ رکھتے ہیں۔ اس وقت دیار ہند میں ان کا کوئی نظیر نہیں ہے۔“ خدائق الخیفہ میں مولانا فقیر محمد جہلی آپ کے تذکرہ کے دوران میں لکھتے ہیں۔ ”بڑے عالم فاضل فقیہ محدث مفسر۔ خصوصاً علم معقولات میں طاق۔ یگانہ آفاق۔ اور صاحب تصانیف علیہ تھے۔ آپ کے فتاویٰ پر علمائے ہند و پنجاب سے کسی کوچوں و جرائ کی طاقت نہ ہوتی تھی۔“

اکبری۔ جہانگیری اور شاہجہانی عہد میں جس قدر علماء و صوفیا نامور ذی علم اور اہل کمال گزرے ہیں۔ سب آپ کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اس وجہ سے نہیں کہ آپ استادالجن تھے۔ بلکہ محض اس لیے کہ ایک عالم کی دوات کی سیاہی ایک شہید کے خون کے قطرہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ کی علمی شہرت و عظمت کے آگے تمام علماء کی گردنیں خم تھیں۔ اور خود شاہان عصر بھی آپ کی اور آپ کے سینے میں جو گنج علم فراواں تھا اس کی توقیر کرتے تھے۔

تمام تذکروں اور تاریخوں میں علامہ عبدالحکیم کا ذکر ملا عبدالحکیم کے نام سے درج ہے۔ ہم نے بھی اس کتاب میں کہیں کہیں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اس لیے اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس زمانہ میں ملا ان ملاؤں کو نہیں کہتے تھے جو آج کل مسجدوں میں نظر آ رہے ہیں اور جن کو اہل محلہ اپنا غلام سمجھ رہے ہیں۔ ملا۔ درحقیقت انتہائے علم کے ایک درجہ کا نام تھا۔ ملا عبد القادر بدایونی اور ملا ابو الفضل کو جانتے ہو۔ جن میں پہلا نہ صرف اکبر کا امام تھا بلکہ اس کے عہد کا بے خوف و بے باک مورخ تھا۔ دوسرا اکبر جیسے شہنشاہ کا وزیر اعظم تھا۔ نواب سعد اللہ خاں اپنی ملازمت شاہجہانی کے ابتدائی ایام میں ملا سعد اللہ لاہوری کے نام سے مشہور تھا۔ علامہ عبدالحکیم کے استاد مولانا کمال کو بھی اکثر کتابوں میں ملا کمال لکھا ہے۔ یہ اس قسم کے ملا تھے۔ جن کے مقدس ناموں پر جن کے کمال علم و فضل پر جن کی اعلیٰ تصنیفات پر آج مسلمانان ہند کو فخر و ناز ہے۔

مولوی عبدالحکیم کی تصنیفات

مولوی عبدالحکیم کی تصانیف کی صحیح اور مکمل تعداد کسی تاریخ سے معلوم نہیں ہو سکی انہوں نے زیادہ تر منطق و فلسفہ کی ادق ترین عربی کتابوں کے حاشیے اور ان کی شرحیں لکھی ہیں۔ صرف ایک کتاب غنیۃ الطالبین ایسی بتائی جاتی ہے جس کو آپ نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ باقی آپ کی تمام تصانیف۔ حاشیے اور شرحیں عربی زبان میں ہیں۔

مآثر الکرام میں آپ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے۔ ”تصانیف او در بلا و عرب و عجم سائر دائرست“ صاحب روضۃ الادباء لکھتے ہیں۔ ”تصنیفات آپ کی بہت مفید ہیں۔ اور اہل علم ان کو بہت پسند کرتے ہیں“۔ چنانچہ آپ نے خیالی کا جو حاشیہ لکھا ہے۔ اس کے متعلق کسی کا یہ شعر مشہور ہے۔

خیالات خیالی بس عظیم است برائے حل او عبدالحکیم است
علاوہ ازیں تفسیر بیضاوی۔ مطول پر حاشیہ اور عبدالغفور کا تکرار آپ نے نہایت
قابلیت سے لکھا ہے۔

مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے آپ کی تصانیف کی جو تعداد معلوم ہو سکی ہے
ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے:-

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی۔ (۲) حاشیہ مطول (۳) حاشیہ عبدالغفور (مولانا

عبدالغفور لاری مولانا عبدالرحمن جامی کے مرید تھے۔ اور ایسے کامل مرید تھے کہ مرشد کا ان
کے متعلق قول تھا کہ ”ایک ہی مرید عبدالغفور لاوی ہزار مریدوں سے بہتر ہے“۔ آپ کے
حق میں مولانا جامی اکثر یہ شعر فرمایا کرتے تھے

آنجا کہ فہم و دانش مرغے بود شکاری

بازے ست تیز رفاں عبدالغفور لاری

(شرح ملا اور نجات الانس کے آپ نے حاشیہ لکھے۔ شرح ملا کا صرف بحث مفردات تک
ہی حاشیہ لکھنے پائے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ آخر مولوی عبدالحکیم نے اس کا تکرار اس تطبیق کے
ساتھ تصنیف کیا کہ ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی کہ مولانا عبدالغفور نے حاشیہ کہاں تک لکھا ہے۔ اور
مولانا عبدالحکیم نے کہاں سے شروع کیا ہے۔ مولانا عبدالغفور کا ۵ شعبان بروز یکشنبہ ۹۱۲ھ
کو انتقال ہو گیا۔) (۴) حاشیہ شریطیہ (۵) حاشیہ شرح مواقف (۶) حاشیہ مقدمات
تلوٹ (۷) حاشیہ شرح عقائد تفتازانی (۸) حاشیہ حاشیہ خیالی (اصل نام احمد بن موسیٰ
البشیر بالخیالی۔ شمس الدین لقب تھا۔ ابتدائی علوم اپنے باپ سے پڑھے پھر مولے
مشغول سے استفادہ کر کے شہر بروصہ کے مدرسہ سلطانیہ کے مدرس ہوئے۔ وزیر محمود پاشا
نے سلطان محمد خاں فرمانروائے ترکی سے آپ کے صاحب کمال ہونے کا ذکر کیا۔ اور کہا
کہ ان کو مدرسہ زینق میں مدرس اعلیٰ مقرر کر دیا جائے۔ تو انبہ ہوگا۔ خلیفہ نے کہا۔ خیالی

وہ شخص تو نہیں ہے جس نے شرح عقائد پر حواشی لکھے ہیں۔ وزیر نے کہا۔ ہاں وہی خیالی ہے۔ خلیفہ نے فرمایا۔ بیشک ایسی اعلیٰ اور اچھی جگہ ایسے ہی قابل کو ملنی چاہئے۔ وزیر نے خیالی کو اس خوشخبری سے اطلاع دی۔ اس نے کہلا بھیجا۔ میں حج کا ارادہ کر چکا ہوں۔ بشرط خیریت واپس آنے کے بعد اس مدرسہ کی خدمات انجام دوں گا وزیر نے کہا۔ پھر موقع نکل جائے گا۔ خیالی نے جواب دیا۔ اگر وزیر اپنی وزارت اور سلطان اپنی سلطنت بھی دیدے تو میں اپنے اس مبارک ارادہ کو ترک نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حج سے واپس آنے کے بعد وہ اسی مدرسہ کے مدرس ہوئے۔ بھر ۳۳ سال کہ عین جوانی کا عالم تھا۔ ۸۷۰ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ بڑے نحیف البدن تھے۔ رات دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے۔ اور ہمیشہ علم و عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ شرح عقائد نسفی پر آپ نے نہایت قابلانہ مگر مختصر حواشی تحریر کئے ہیں۔ جو متداول بین الدرس والتدریس ہیں۔ لیکن بعض مواقع پر اس وقت کو کم فرمایا ہے کہ بڑے بڑے علماء اس کے حل کرنے میں حیران رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ان حواشی کا حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے ایسا عمدہ لکھا کہ تمام مشکلات و مفصلات کو حل کر کے طلباء کے لئے آسان کر دیا۔

آپ کے ایک شاگرد اسماعیل بن بابی قرامانی (کمال الدین لقب المعروف قرہ کمال وفات ۹۳۰ھ) نے بھی آپ کے حاشیہ شرح عقائد کی شرح ۹۲۹ھ میں لکھی۔ لیکن مولانا عبدالحکیم کی شرح جب مشہور ہوئی تو اس کا فروغ جاتا رہا۔

(۹) حاشیہ شرح شمسۃ قطبی میر (۱۰) تکملہ عبدالحکیم شرح جامی (۱۱) حاشیہ شرح مطالع (۱۲) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۳) درہ شمسیہ در ثبات واجب الوجود (۱۴) حواشی در کنار شرح حکمت العین (۱۵) حواشی در کنار شرح ہدایہ حکمت (۱۶) حواشی در کنار شرح الارواح (۱۷) ترجمہ غنیۃ الطالبین تصنیف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (عربی سے فارسی میں) (۱۸) شرح تہذیب محشی۔ اس کی شرح مفتی عبداللہ و شیخ الاسلام نے بھی لکھی

ہے۔ لیکن مولوی عبدالعظیم نے جو شرح لکھی ہے اس کو سب پر فوقیت ہے (۱۹) القول المحیط۔ یہ رسالہ تحقیق جعل مرکب و جعل بسیط علم منظر میں ہے (۲۰) کتاب مشہور (۲۱) دلائل التجدید (حضرت مجدد الف ثانی کے دعویٰ کی تائید میں) (۲۲) سیالکوٹی التصورات (علم منطق میں)

مولوی عبدالعظیم نے جو شرحیں لکھیں اور جو حواشی مختلف ادق کتابوں کے تحریر کئے۔ انہوں نے آپ کی شہرت و عظمت کو علمائے عصر میں ممتاز جگہ دی۔ مگر اس زمانہ میں ایسے علماء بھی موجود تھے جس کو آپ کے خیالات سے اختلاف تھا۔ علم کلام۔ علم نحو اور فلسفہ و الہیات میں جو کچھ آپ لکھتے تھے۔ علماء اس کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں تھے۔ مولانا اپنی خیالات آزادی سے ظاہر کرتے اور لکھتے تھے۔ اور دیگر علماء بھی ان سے اختلاف کرتے میں پوری جرأت و بے باکی سے کام لیتے تھے۔

ملا عبدالرزاق بانڈے کشمیر کے جلیل القدر عالم معقولات میں بے نظیر تھے۔ شرح تجرید کا حاشیہ لکھا تو شاہجہان نے ازراہ قدر دانی مدرسہ کابل کا مدرس مقرر کر کے افغانستان بھجوایا۔ کتاب محاکمات کا رد لکھتے لکھتے دماغ میں خلل آ گیا۔ اور اپنے آپ کو زخمی کر دیا۔ آخر عمر میں کشمیر چلے آئے۔ اور وہاں انتقال کیا۔ مولانا عبدالعظیم کے اکثر حواشی کے رد آپ نے لکھے ہیں۔ اور چونکہ ملا عبدالرزاق اور مولانا عبدالعظیم کا زمانہ ایک ہی تھا اس لیے ممکن ہے لاہور۔ سیالکوٹ یا دہلی کسی مقام پر آپس میں ملاقاتیں بھی ہوئی ہوں اور وہ باتیں جو کاغذوں پر تحریر ہوتی تھیں زبانوں پر بھی آ گئی ہوں۔

ملا عبدالرزاق کے بعد کشمیر میں ایک اور یگانہ روزگار عالم کے نام نظر آتا ہے جس نے ملا عبدالعظیم کے اکثر حواشی کا رد لکھا۔ اور ان کے خیالات کی تردید کی ہے۔

ملا ابوالحسن مصروف یہ شاہم بابا تھا۔ ملا یوسف گنائی کشمیری (وفات ۱۱۸۴ھ) کا قول ہے کہ جب ناظمین خطہ کشمیر علماء کا مباحثہ کراتے تھے۔ تو آپ تفسیر بیضاوی اور حاشیہ

عصام وغیرہ کی عبارتیں اس طرح بے تکلف اور بے تکان پڑھتے تھے جس طرح قرآن کے حافظ قرآن کو پڑھتے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف

مولوی عبدالحکیم کی بیس ۲۰ تصانیف کا ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف علم نحو۔ علم کلام۔ علم منطق اور فلسفہ والہیات میں ہیں۔ ان پر تبصرہ و تنقید کرنا اور اس قسم کے اہل علم کی مجلسوں کے بحث و مناظرہ پر رائے لکھنا تو بڑی قابلیت بڑے دماغ اور بہت بڑے منطقی و فلسفی کا کام ہے جو عربی کے ہر علم پر حاوی ہو۔ لیکن یہ زمانہ تو اس قسم کی تاریکی کا ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے والے بھی شاید ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ مدرسہ نعمانیہ لاہور یا اسی قسم کی چند اور عربی درسگاہوں میں نظر آسکیں گے۔

ان حالات میں مولانا عبدالحکیم کی تصانیف کی تعداد بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن ”سوانح ملک العلماء مولوی عبدالحکیم“ کی خوش قسمتی سے مولانا مولوی محمود علی صاحب ایم۔ اے۔ ایم او ایل پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا۔ اور ان کی تین تصانیف پر جو علم نحو۔ علم منطق اور علم کلام کے متعلق ہیں ذرا تفصیل سے بحث کی۔ مولانا محمود علی نے جس قابلیت سے مولانا عبدالحکیم کی ان تین کتابوں کے نفس مضمون۔ بحث مباحثہ اور طرز تحریر پر شبذیز قلم کی جولانیناں دکھائی ہیں۔ اور اس زمانہ کے طرز تصنیف پر جس خوبی سے بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کسی اور سے مشکل تھا۔ اور اگر آسان بھی ہوتا۔ تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ ان ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ منطق و نحو کی پیچیدگیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہوتا۔ اور اپنے آرام کو حرام کرتا۔ یہ خون جگر تو وہی کھاتا ہے جس کو بزرگان سلف کا نام نیک قائم رکھنا منظور ہو۔ جو علمائے سلف کی منطقی و فلسفی بحثوں کے ٹکڑے بطور تبرک بائٹنا کا رثواب جانتا ہو۔ اور جس کو مولانا عبدالحکیم کے علوم حکمیہ و

الہیات کا کچھ علم ہو۔

قبل اس کے کہ ہم مولوی محمود علی صاحب نے جو مولانا عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے درج کریں ایک نظم جو مولانا عبدالحکیم کے فضائل پر ہم کو موصول ہوئی ہے درج ذیل کرتے ہیں:-

نظم در فضائل علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مرحوم

جب میں نے پہلے پہل ۱۹۱۹ء میں علامہ سیالکوٹی کے سوانحات عمر لکھنے کا ارادہ کیا تو سیالکوٹ۔ امرتسر۔ جہلم۔ لاہور اور ڈھا کہ کے خاص احباب سے جو علامہ مرحوم کے فضائل و مراتب سے آگاہ تھے۔ اس کتاب کی تصنیف میں کچھ مدد طلب کی۔ اسی سلسلہ میں میرے دوست ملک محمد صاحب قادری۔ ٹھیکہ دار جہلم نے چند ابیات مولانا مرحوم کے متعلق ارسال کیئے۔ جو ذیل میں شکر یہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں:-

کلک من سر بہ خم شد از تسلیم	بہ ثنائے جناب عبد حکیم
شیخ سنت امام فقہا بود	آں مفسر کلام رب غفور
بر زبانش رموز قرآنی	در بیانش علوم یزدانی
در فروع و اصول گفت سخن	فقہ را از و چراغ شد روشن
چوں قلم در بیان فلسفہ راند	منطقی را مجال نطق نہ ماند
پیرو اجتهاد نعمائی	ہم سبق با امام ربائی
در اصول و فروع نکتہ شناس	منطق و فقہ را بلند اساس
در تصانیف برترش پایہ	ہمہ ش کس نبود و ہمسایہ
ترجمان حقیقت قرآن	فخر احناف و مقتدائے زماں
گشت سلکوٹ جائے آرامش	در ہمہ ہند سکۂ نامش

صدر اسلامیان و شیخ الکل
 شمع اسلام و افضل الفضلاء
 فوق را ذوق باد و قلب سلیم
 مرغ طبعم پر وہ اوج بلند
 لیک قاصرز وصف مولانا
 معترف عجز خویش سرتاپا
 رہنمائے طریق ختم رسل
 فخر فقہاء و زینت علماء
 کہ نوید حیات عبد حکیم
 نظم موزون آورد بہ کند
 اے ملک زین سخن زبان در بند
 روح اورا کن از دعا خورسند

حاجی محمد سعید اور علامہ عبدالحکیم

تذکرہ اکابر اسلام میں لکھا ہے۔ حاجی محمد سعید ایک بڑے عالم فاضل اور قناعت پیشہ بزرگ تھے۔ ان سے نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ جو شرافت و نجابت کے علاوہ علم میں بھی ان کی برابری نہ کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے اپنی چالاکیوں اور زمانہ سازیوں سے بڑے بڑے مراتب پر پہنچ کر مالا مال ہو رہے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ علامہ عبدالحکیم اور نواب سعد اللہ خاں وزیر کہ دونوں ہم مکتب اور علم و فضل میں یکساں درجہ رکھتے تھے۔ اور حاجی محمد سعید کے کمالات کے بھی معترف تھے۔ شاہجہان کے حکم سے حاجی محمد سعید کے پاس آئے اور اصرار کیا کہ بادشاہ بلاتا ہے۔ آپ ضرور تشریف لے چلیں۔ ایک اعلیٰ عہدہ بھی آپ کے سپرد ہونے والا ہے۔ مگر آپ نے بادشاہ کے پاس جانے اور ملازمت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ علامہ عبدالحکیم مجبور ہو کر نا کام واپس چلے آئے۔ (اور کیا عجب ہے ان دونوں صاحبوں نے ہی بادشاہ کے پاس حاجی صاحب کا ذکر کیا ہو۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ حاجی صاحب سیالکوٹ میں تھے یا لاہور میں رہتے تھے۔)

شیخ سعدی کی گلستاں اور علامہ عبدالحکیم

کارنامہ میں لکھا ہے۔ ایک دن نماز ظہر کے بعد مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی سر بزانو بیٹھے تھے کہ ایک شاگرد نے اس فکر و تردد کا سبب پوچھا۔ کہا۔ شیخ سعدی کے اس فقہ از بستر زمش بر خاکستر گرمش“ کے جواب کا کوئی فقیرہ سوچ رہا تھا۔ دماغ نے بہت چکر کھائے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

(میرے والا صاحب قبلہ فرماتے ہیں ہمارے استاد مولوی امام بخش مرحوم (آج سے قریباً پچاس سال پیشتر) ایک قلمی وغیر مطبوعہ کتاب کارنامہ ہمیں پڑایا کرتے تھے۔ اس کتاب میں ندرت گلستاں کے اس اعتراف کا ذکر ہے جو سطور بالا میں درج کیا گیا ہے۔ ابوالفضل نے بھی شیخ سعدی کے اس فقرہ ”اسم بے جو بود و نمد زین بگرد“ پر لکھا ہے میری ساری انشا پردازی ان چند الفاظ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔)

تبصرہ

مولانا محمود علی نے علامہ عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف پر جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے اور درحقیقت یہی تبصرہ اس مختصر سی کتاب کی جان ہے:-

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ممالک غیر کے علماء اپنی تصانیف میں ”فاضل لاہوری“ کے نام سے یاد کرتے ہیں) ان ممتاز اور نامور علمائے اسلام میں سے ہیں جن کی تحریروں کو جو ہر شناسان علم و فضل نے سر آنکھوں پر لیا۔ اور اعلیٰ ترین قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور جن کو نہ صرف فرداً فرداً اپنی علمی تشنگی کو بچھانے اور دماغ کو روحانی غذا دینے یعنی مطالعہ کا لطف اٹھانے کے لیے استعمال کیا بلکہ ان کو دیگر رہروان بادبہ حکمت اور سالکان طریق فضیلت کے لیے مشعل راہ بنایا یعنی طالبان علم کے نصاب درس میں داخل

کیا۔ اور نہ صرف ایک آدھ تصنیف کسی فن میں معتبر سمجھی گئی بلکہ مختلف فنون میں آپ کے تین کارنامے محققانہ معیار سے مستند مانے گئے۔ اور مشتاقان علم کے لیے بیش بہا تحفہ قرار پائے۔ مولانا کس کس فن میں کمال کا رتبہ رکھتے ہیں۔ اور کہاں کہاں ان کے شبدریز قلم نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ملا میرزاہد (ملا میرزاہد فلسفہ والہیات کے نامور ترین علماء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اور ان کی تین تصنیفیں (میرزاہد رسالہ۔ میرزاہد ملا جلال اور میرزاہد امور عامہ) درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ کسی کتاب میں تو دیکھا نہیں مگر اہل علم کی مجلسوں میں مسرت کے ساتھ یاد رفتگان کرتے ہوئے یہ ذکر ہوا کیا ہوا ہے کہ جب ملا میرزاہد ہرات سے ہندوستان میں آئے ہیں تو شاہجہان کے دربار میں ان کا مولانا عبدالحکیم سے مناظرہ قرار پایا۔ فریقین نے مختلف عالمانہ نکات میں ایک دوسرے کا امتحان لیا۔ اور اہل دربار میں علمی جواہر ریزوں سے اپنا جیب و دامن بھرا۔ آخر میں مولانا عبدالحکیم نے ایک ایسا سوال پیش کیا جس کو ملا میرزاہد حل نہ کر سکے اور کامیابی کا فخر مولانا عبدالحکیم کو نصیب ہوا۔ دربار میں فوقیت مولانا عبدالحکیم کو حاصل ہوئی۔ مگر اہل علم کا اپنا دربار الگ ہے۔ اس میں اس مباحثہ پر جو نکتہ چینی ہوئی تو فیصلہ یوں کیا گیا کہ مولانا عبدالحکیم اپنی ذہانت و طباعی سے بحث کو قواعد انسانیہ کی طرف لے آئے کہ یہ رستہ ان کا خوب دیکھا بھالا ہے چنانچہ انہوں نے علم کی ظرف کا ایک ایسا سوال پیش کیا جو ملا میرزاہد کو متحضر نہ تھا۔ ورنہ اگر بحث علوم حکمیہ اور الہیات میں محدود رہتی تو میرزاہد کے آگے عبدالحکیم کی پیشرفت دشوار تھی۔ یہ فیصلہ صحیح ہو یا شاہی دربار کا غلغلہ تحسین مدعا اس حکایت سے یہ ہے کہ مولانا عبدالحکیم کا پایہ جو زمانہ سلف کے علمائے کبار اور شاہان علم دوست کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتا ہے اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ معمولی نوشت و خواند کے لوگ آپ کی تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالیں اور کسی نتیجے پر پہنچیں۔) یا ان جیسے مولانا عبدالحکیم کے ہم پلہ حریف ہی کر سکتے ہیں۔ ہم لوگوں نے جس تاریکی اور جہالت کی فضا میں آنکھ کھولی ہے اور علوم قدیمہ

اسلامیہ کے متعلق جس کسمپرسی اور بے پروائی کا دور دیکھا ہے۔ اس نامبارک عہد میں اگر کوئی شخص آپ کی تصانیف کے بیشتر حصہ کو سمجھ سکی تو اپنے وقت کا فاضل مہجر کہلانیکا مستحق ہے سمجھنے کے بعد صحت و سقم مضمون کی نسبت رائے قائم کرنا الگ رہا۔ اندریں حالات آپ کی تصانیف کے متعلق جو کچھ لکھا جائے گا وہ سوانح عمری کے ایک باب کی خانہ پری کرنے کی غرض سے ہوگا۔ ورنہ ایسا تبصرہ جس کو تنقید کہا جائے اور جس میں تصنیف کی قدر و منزلت اور اس کے صحت کو سقم کی تحقیق ہو۔ اپنی قابلیت سے بالاتر ہے۔

ان تصانیف کی نسبت کچھ لکھنے سے پہلے اس زمانہ کے عام اور دلپسند طرز کی تصنیف کا ذکر کرنا ضرور ہے۔ اسلامیوں نے علم و فن کی جانب توجہ کی۔ اور تصنیف تالیف کا سلسلہ آغاز ہوا۔ تو چونکہ تمام قوم کو جہالت کی تاریکی سے نکالنا اور ایسے مضامین کو لوگوں کے ذہن نشین کرنا مقصود تھا۔ جس سے اس وقت تک ان کے کان آشنا نہ تھے۔ اس لیے ہر ایک مضمون کو نہایت سلیس۔ نہایت آسان اور نہایت مشرح طور پر بیان کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ ہمارے متقدمین علماء کی تصانیف قواعد لسانیہ میں مسائل مذہب میں اور علوم عقلیہ میں۔ غرض علم کے ہر شعبہ میں نہایت قریب الفہم نہایت مفصل اور نہایت صاف واقع ہوئی ہیں۔ وہ لوگ کسی فن کو ہتمامہ بیان کرنا چاہتے ہیں..... یا علم کے کسی ایک یا چند مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ہر حال میں ان کی تحریر پیچیدگی سے پاک اور اجمال و اختصار سے مبرا ہوتی ہے۔ مگر اس طرح پر قوم میں علمی مذاق پیدا ہو گیا۔ اور تہذیب کی ترقی نے کئی طرح کی مصروفیتیں اور مختلف الاقسام مشاغل و افکار پیدا کر دیئے تو حسب قاعدہ طبیعتوں میں نفاست اور نزاکت پیدا ہوئی۔ ادھر علم کی چاشنی حاصل کرنے کے بغیر سوسائٹی میں اعزاز و افتخار پیدا کرنے کی کوئی صورت نہ رہی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ جہاں تک ہو سکے کمتر وقت میں علم کی بیشتر واقفیت حاصل ہو۔ اس کام کے لیے مختلف علوم کے چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف ہونے شروع ہوئے۔ جن میں سے کچھ تو اسی شکل کے ہیں جیسے ہمارے

زمانے میں انگریزی کے اندر مینوئل کہلاتے ہیں۔ یعنی ہر علم کے چند نہایت ضروری اور موٹے موٹے مسئلہ تحریر کر دیئے گئے جو تھوڑے وقت میں یاد ہو سکیں۔ اور علم کی ابتدائی واقفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوں۔ ایسے رسالہ جات مبتدیوں کے لیے بیشک کارآمد تھے۔ اور تعلیم کی ابتداء انہی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی علم سے واقف ہونے کا دعویٰ محض انہی رسالوں کو پڑھ لینے سے نہیں ہو سکتا۔ اور ضرورت باقی رہتی ہے کہ ان کے بعد مبسوط کتابیں مطالعہ میں آئیں جو وقت بہت لیتی ہیں۔ اس وقت کو رفع کرنے کے لیے قدرت نے ایسے افراد پیدا کئے جو مختصر نویسی میں نام بردار ہوئے۔ انہوں نے دریاؤں کو کوزوں میں بند کرنا شروع کیا۔ اور ہرفن کے اندر ایسی کتابیں مہیا کر دیں جو حجم میں چھوٹے رسالوں کے برابر تھیں۔ اور ہرفن کے مضمون سے کوئی نکتہ فرو گذاشت نہ کرتی تھیں۔

بعض ایسے رسالوں میں اور ان کے بعد کی اکثر تصانیف میں ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ کثرت معلومات نے مصنفین کے دماغوں کو مرکز ثقل سے ایسا ہٹا دیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔ گرامر کی کتاب مگر اصطلاحوں کی تعریف کرتے ہیں یا قواعد کلیہ قائم کرتے ہیں منطقی اور فلسفیانہ دلائل اور اعتراضات نظر آتے ہیں۔ تو ان کو بھی اپنی اسی مختصر نویسی کے انداز میں درج کر جاتے ہیں۔ مذہبی مسائل اور ان کے تشریح و توضیح میں کثرت سے فلسفیانہ اصطلاحیں اور اشارات درج کر دیتے ہیں۔ معقولات میں تعریف اور استدلال کے اثناء میں لفظوں کے ہیر پھیر اور طرز ادا کی درستی و نادرستی کا خیال آ جاتا ہے تو گرامر اور ہرفن بلاغت کے مسائل درج ہو جاتے ہیں۔ اور تحریر کو دشوار سے دشوار تر کر دیتے ہیں۔ غرض جس طرح فارسی اور اردو کی شاعری میں ہمارے ناظرین کو معلوم ہے کہ شعرائے متقدمین کی نسبت متاخرین نے پیچیدگی اور دشواری کو زیادہ کر دیا ہے۔ بعینہ اسی طرح علمائے متقدمین و متاخرین کی طرز تصنیف میں سلاست اور پیچیدگی ہمارے لفظ خیال سے آسانی و دشواری کا تفاوت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اس وقت ایک عرصہ کے علمی تو ضل اور کئی

نسلوں کی روشن خیالی نے طبیعتوں کو ایسا ذکی اور ذہنوں کو ایسا تیز کر دیا تھا کہ معما اور چیتاں کو حل کرنے میں دشواری اور مجمل تحریروں کو سمجھنے میں وقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور ایک فن میں دوسرے فن کی آمیزش کو دل بہلانے کا ذریعہ اور ضیافت طبع کا سامان سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کے خلاف تمام کتاب میں ایک ہی مضمون پر بحث ہو تو طبیعت کے اکتانے کا سبب اور ملال کا باعث جانتے تھے۔ ایسی کتابیں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ اور طالب علم ہر ایک فن کے ایسے ایسے رسالے جن کو اصطلاح میں متن کا نام دیا گیا ہے یاد کر لیتے تھے۔ پھر یاد دیگر مشاغل میں مصروف ہو جاتے تھے یا تحصیل علم کا شوق رکھتے تھے تو کسی ایک یا چند فنون کے اندر مبسوط کتابوں کا مطالعہ جاری رکھ کر اپنے تئیں کمال کو پہنچاتے تھے۔

اب زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ اور اقبال مندی کے کمال نے بدن میں کاہلی اور دماغ میں کنڈی پیدا کی تو مجمل رسالے دشوار نظر آنے لگے۔ اور مبسوط کتابوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ رہی۔ اس ضرورت نے ایسے لوگ پیدا کئے جو متنوں پر شرحیں چڑھائیں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام کریں۔ مگر مختصر نویسی یا بالفاظ دیگر معما گوئی کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ اور کفایت شعاری کا سب سے زیادہ زور لفظوں پر خرچ کرنا کمال مانا جاتا تھا۔ اس لیے شارحین نے بھی جہاں تک بن پڑا۔ کم سے کم لفظوں سے کام لیا۔ اور بعض شرحیں ایسی لکھی گئیں جن کے الفاظ کا شمار متن کے الفاظ سے بھی زیادہ نہ ہو (تفسیر جلالین کی نسبت مشہور ہے کہ اس کے اپنے الفاظ تعداد میں قرآن کریم کے الفاظ سے کم ہیں۔) کچھ عرصہ تک اسی کو غنیمت سمجھا گیا۔ کہ متن کو ساتھ ملا کر عبارت کم از کم دگنی تو ہو گئی۔ مگر آخر تھیں شرحیں بھی متن کی ہم پلہ۔ طبیعتیں پھر اکتائیں اور خیالات ادھر ادھر دوڑنے لگے۔

ہمارا یہ زمانہ ہوتا تو ایسے تمام متن اور شرحیں دریا برد کر دی جاتیں۔ اور سہل کتابوں کی تلاش ہوتی۔ کیونکہ ہم نے انگریزی علوم و فنون میں ہمیشہ سرچ الفہم کتابیں داخل نصاب دیکھی ہیں۔ اور ہمارے علماء علوم اسلامیہ کے درس میں بھی ایسی ہی سہولتوں کا

اہتمام کرتے جاتے ہیں۔ مگر اس وقت ایسا نہ ہوا۔ اور ایک خیال سے میں سمجھتا ہوں کہ بہتر ہوا۔ میں مختصر نویسی کا ایسا مداح نہیں ہوں مگر اکثر درسی کتابوں میں جو ایک فن کے اندر دیگر فنون کے تذکرے آجاتے ہیں اس کو فائدے سے خالی نہیں سمجھتا۔ انگریزی مدارس میں آرٹس فیکلٹی کے اندر متعدد علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اور جتنے سال تک تعلیم جاری رہتی ہے بار بار سب علموں میں امتحان لیا جاتا ہے کہ مضامین مستحضر رہیں۔ مگر یہ طریق کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اس میں مستحضر رہنا ایک طرف۔ مضامین کو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں ہوتی۔ اور اکثر الفاظ کو رٹ لینے سے کامیابی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس نصاب میں مختلف علوم کو ہمیشہ جاری رکھنے اور ان کا امتحان لیتے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک علم کو پڑھتے ہوئے دیگر تمام مروجہ علوم کے مسائل مستحضر ہوتے رہتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ طالب علم مضمون کو سمجھ کر آگے چل سکتا تھا۔ ورنہ محض عبارت کو بر زبان کر لینے سے کام نہ چلتا تھا۔ غرض ہمارا طالب علم ایک سپاہی ہوتا تھا جو ہمیشہ جنگ کے لیے تیار اور جو بات پوچھی جائے اس کا جواب دینے کے لیے مستعد ہے۔ مگر آج کا طالب علم امتحان سے دوسرے دن کسی بات کے جواب دینے کا ذمہ دار نہیں۔ ہاں خاص فن میں کامل ہونے کا فائدہ ہمارے نصاب سے حاصل نہ ہوتا تھا۔ اور وہ فائدہ آج کل کی تعلیم سے بھی نہیں ہوتا۔ مطالعہ کرنے کے قابل ہو جانے کا فائدہ ہی اس سے بھی مقصود تھا اور اس سے بھی۔ آگے ایک فنی ہونا طویل مطالعہ پر جب بھی منحصر تھا۔ اب بھی۔

بہر کیف شرحوں کو مشکل سمجھ کر چھوڑا نہیں گیا۔ ان پر حواشی لکھے گئے۔ بعض وقت

وہ بھی مجمل اور دشوار ہوئے تو حاشیہ پر حاشیہ چڑھا۔ اور جو مسئلہ متن میں سو پردوں کے اندر رکھا گیا تھا۔ اس پر سے کسی نے ایک کسی نے دو۔ اور کسی نے سب پردے اٹھا دیے مسئلہ کو صاف کیا۔ اس پر اعتراض وارد ہو تو اس کی تشریح کی اور جواب دیا۔ جواب پر اعتراض ہوا۔ یا اس سے کوئی نئی بحث پیدا ہو گئی تو اس کی تنقید ہونے لگی۔ پڑھنے والا بالکل ہی غبی ہو

تو اور بات ہے ورنہ طالب علم کو ایک بات پر جمایا جاتا ہے پھر اکھیڑا جاتا ہے کبھی ایک پہلو سمجھایا جاتا ہے کبھی دوسرا۔ اس کے دماغ کو دلائل کے پرکھنے کی۔ ان کے ہر ایک نکتہ پر غائر نظر ڈالنے کی اور فیصلہ کرنے سے پہلے تمام اطراف و جوانب کو دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ وہ کتاب نہیں۔ جمناسٹک کا میدان معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دڑل ماسٹر لڑکوں کو کبھی بیٹھنے کا حکم دیتا ہے۔ کبھی بھاگنے کا۔ کبھی ہاتھ بلند کراتا ہے اور کبھی ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ طرح طرح کی مشق سے ہر عضو کو کام کرنے اور مختلف حرکات سے ان کے تئیں مضبوط بنانے کا اثر دکھاتا ہے۔ اس تعلیم سے دماغی قوتوں سے یونہی مشق کرائی جاتی تھی۔ ہمارے زمانے کی سہل گیر طبیعتیں اس طرز کو ناپسند کریں تو تعجب نہیں۔ افسوس ان بزرگوں پر ہے جو اس چمن کی لکچینی کر کے گل فروش کہلائے۔ اور اسی طرز تعلیم کی بدولت قوت فیصلہ سے بہرہ اندوز ہوئے اور پھر اپنے ہی بزرگوں کی محنت کو رائیگاں اور ان کی کوششوں کو بے سود مشہور کرنے میں سب سے سبقت کرنے اور نئی راہیں ڈھونڈنے لگے۔ وہ بزرگ ان کی بات سنتے تو یہی کہتے۔

سخن شناس نہ دلبر اخطا بیخاست

اس کوشش اور کاوش میں بعض بزرگوں نے اپنا نصب العین اور زندگی کا مدعا ہی چمنستان علم کی نخل پیرائی اور مشکل کتابوں کی عقدہ کشائی کو قرار دیا۔ ان رہنمایان وادی پر خار میں میر سید شریف جر جانی۔ مولانا بحر العلوم عبد العلی لکھنوی۔ ہمارے مخدوم مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی۔ یا ہمارے قریب تر زمانے میں مولانا عبد الحکیم لکھنوی اور ان کے فرزند مولانا عبدالحی لکھنوی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت سینکڑوں قابل قدر بیش قیمت مگر مشکل تصانیف کے گرانہا جو ہر ریزے صاف و مجلا ہو کر ہم تک پہنچے۔ اور اسلامی لٹریچر کی نفیس سے نفیس نعمتیں اور باریک و لطیف بحثیں قیام و استحکام کا خلعت پہن کر اور سلاست و سہولت کے زیور سے آراستہ ہو کر نابینا کو بینا اور بے

دست و پا کو کار فرما بنانے کا باعث ہوئیں۔ سمجھنے میں ہماری ہمت تصور کرے۔ اور ہماری نظر شیر چشمی دکھائے تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔

مولانا عبدالحکیم کی تمام تصانیف کا علم نہیں جن کارناموں نے آپ کو علمی دنیا سے روشناس کیا ہے اور جو تصانیف آپ کی طالبان علم کی رہنمائی میں استعمال ہوئی ہیں ان کا مدعا اپنی یادگار قائم کرنے کی خواہش یا اپنے علم و فضل کو ظاہر کرنے کی آرزو کو برلانے کی بجائے بزرگان سلف کے زریں کارناموں کو جلا دینا اور ان کے اسمائے گرامی کو حیات جاوید بخشنا ہے۔ یعنی علمی خدمت کے ساتھ ایثار اور عرفیت جہالت کو زیر کرنے کے ساتھ دیگر نبرد آزماؤں کی حمایت کو اپنا فرض قرار دیا ہے۔ اور وہ بھی ایسے ایسے موقع پر جہاں کوشش پر کوشش ہوئی ہے مگر عقدہ کشائی نہیں ہو سکی۔ یعنی آپ نے کسی متن کی شرح نہیں لکھی۔ کسی شرح کا حاشیہ نہیں لکھا بلکہ حاشیہ پر حاشیہ چڑھایا۔ اور ہمیشہ تخم زمیں گیر کو گل و گلزار بنایا ہے۔ اور میں نے اس مضمون میں اپنے تمہیدی اظہار کو طول دیا ہے تو اسی غرض سیکہ اس کے بغیر ناظرین کو ایسی تصانیف کی ضرورت اور ان کی قدر و منزلت کی نسبت صحیح رائے قائم کرنے میں دشواری ہوتی۔

آنجناب کی ایک تصنیف فن نحو میں ہے۔ اس کا ماجرا یہ ہے کہ ابن حاجب نے شافیہ اور کافیہ نام کے دو رسالے صرف اور نحو میں لکھے۔ جن میں ترتیب مضامین کے اسلوب کو بدلا جو پسند کیا گیا۔ اور مختصر نویسی کا وہ کمال دکھایا کہ تمام مسائل اور اصطلاحات فن کی تشریحیں دو دو۔ تین تین لفظ کے جملوں میں ختم کیں۔ اور بہت چھوٹے حجم کی تحریروں میں تمام مہتمم بالشان مسائل درج کر دیئے۔ ان دونوں رسالوں نے علمی دربار سے قبولیت کا خلعت پہنا۔ اور مختلف دیار و امصار پر تصرف کیا۔ ہر ایک رسالے کی کئی کئی شرحیں لکھی گئیں۔ جن میں سے چند متن کے ساتھ قبولیت کی حصہ دار بنیں منجملہ ان کے کافیہ کے ایک شرح شاعری اور تصوف کے میدان میں شہسواری کرنے والے مولانا عبدالرحمن جامی

علیہ الرحمۃ کے قلم سے بھی نکلی۔ مگر کیسی شرح کہ متن کی طرح مختصر نویسی کا بہترین نمونہ اور مضمون کے لحاظ سے فن کی اعلیٰ ترین کتاب۔ قبولیت متن سے زیادہ اسپر عاشق ہوئی اور مان لیا گیا کہ جس نے شرح جامی نہیں پڑھی اس نے نحو میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اختصار میں یہ کمال کہ ایک ایک لفظ کے اندر باریک نکات کا خزانہ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شرح جامی کے اندر حرف حرف کے سایہ میں شیر سوتے ہیں۔ اس گنج شائگان کو جو قدم قدم پر فن کیا گیا ہے تفتیش و تلاش کرنے کی ضرورت خود مصنف ہی کے زمانہ میں محسوس ہونے لگی۔ اور مولانا جامی کے شاگرد ملا عبدالغفور نے اس پر حاشیہ لکھا جو طالبان علم کی بد قسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ اور قریباً کتاب کے دوثلث یعنی مبدیات میں اسماء الافعال کی بحث تک لکھا جا کر کسی وجہ سے بند ہو گیا۔ اول تو ملا عبدالغفور مولانا جامی کے شاگرد اور اسی طرز تحریر کے شیدا تھے اجمال کو پورے طور پر تفصیل نہ بنا سکے۔ دوسرے جو کچھ کیا وہ بھی نامکمل رہ گیا۔ اس نقصان کی تلافی مولانا عبدالکحیم کی قسمت میں تھی۔ آپ نے پہلے ملا عبدالغفور کی تحریر پر حاشیہ لکھا۔ پھر جس قدر کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کی۔ اور شرح جامی کا حاشیہ آخر تک پہنچایا۔ اس کوشش نے اپنے نوعیت کے بہترین متن اور اسکی بہترین شرح کو ایسا واضح کر دیا کہ اس مجموعے کے بعد عربی فن نحو کے لیے جس میں اکثر زبانوں سے زیادہ پیچیدگی ہے کسی اور کتاب کی ضرورت نہ رہی۔

میں مولانا جامی کی اختصار پسندی و باریک بینی اور دونوں حاشیہ نگاروں کی متحدہ کوشش سے اس کے وضاحت پانے کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

(۱) ذکر یہ تھا کہ کبھی جملہ اسمیہ کے مبتداء کو حذف کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس کی مثال میں ابن حاجب نے چاند دیکھنے والوں کا محاورہ پیش کیا۔ اور چاند دیکھنے والے کے لیے مستهل کا لفظ استعمال کیا۔ مولانا جامی نے مستهل کے معنی لکھے ”چاند دیکھنے والا اور آواز بلند کرنے والا“ ایک لفظ اور دو معنی۔ مختصر نویسی کو دیکھتے ہوئے عجیب بات تھی۔ محشی کو اس اعتراض کا صاف کرنا ضرور تھا۔ ملا عبدالغفور نے لغت سے استدلال کیا۔ اور بتایا کہ مستهل

جس مصدر سے نکلا ہے اس کے معنی ہی دو ہیں۔ چاند دیکھنا اور آواز بلند کرنا۔ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اور بات چھپی رہ گئی یعنی اعتراض یہ تھا کہ لفظ کے معنی چاہے کئی ہوں بولنے والا جب بولتا ہے تو ایک ہی معنی مراد لیا کرتا ہے۔ ماتن نے یہ لفظ استعمال کیا۔ شارح کو بتانا چاہئے کہ اس نے یہاں اس لفظ سے کونسا مطلب لیا ہے۔ اس غرض کے لیے شارح نے جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہے ایک بار بولنے میں دو معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ یہ کام مولانا عبدالحکیم کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا انہوں نے فرمایا کہ دو معنی لکھنے سے یہ مطلب نہیں کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ بلکہ دکھانا یہ مقصود کہ لفظ کے معنی دو ہیں۔ اور ماتن کے کلام میں دونوں میں سے ہر ایک مراد ہو سکتا ہے۔

(۲) اسم اشارہ کی بحث میں ابن حاجب نے لکھا ہے۔ ”کہا جاتا ہے ذال اشارہ قریب کے لیے۔ ذلک بعید کے لیے۔ اور ذاک متوسط کے لیے“ کہا جاتا ہے ”ایک زائد لفظ تھا۔ جو خاص اسی مسئلہ پر لکھا گیا۔ اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بعینہ اسی طرح استعمال نہیں ہوتے بلکہ جو قریب کے لیے ہے بعید کے لیے۔ اور جو بعید کے لیے ہے قریب کے لیے۔ اور متوسط کے لیے ہے وہ دونوں کے لیے زبان عرب میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس لیے ماتن کے معنوں کی تعیین کرنے کو فن کا کلیہ قاعدہ تصور نہیں کیا۔ بلکہ ”کہا جاتا ہے“ کے لفظ سے اس کو شک کیہ طور پر ذکر کر دیا ہے۔ ملا عبد الغفور فرماتے ہیں کہ کافیہ کے شارح رضی نے بھی یہی وجہ لکھی ہے مگر صحیح نہیں۔ کیونکہ فن بلاغت کے علماء لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ اپنے معنوں کے سوا دوسرے معنوں میں تاویل سے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی مثلاً قریب کا لفظ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اسی صورت میں جبکہ شاعرانہ طور پر مبالغہ کے لیے اس کو بعید فرض کر لیا جاتا ہے۔ علمائے بلاغت کے اس بیان سے ثابت ہوا کہ معنوں کی تعیین فن کا کلیہ قاعدہ ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ذال اور ذالک قریب اور بعید کے لیے وضع نہیں کئے گئے۔ بعد میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ پس ابن حاجب

نے کہا جاتا ہے "کالفظ اس لیے بولا ہوگا کہ یہ معنی استعمالی ہیں۔ یوں نہ کہتے عام طور پر یہ لکھ دیتے کہ ذاقرب کے لیے ہے تو سمجھا جاتا کہ لفظوں کی وضع بیان کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحکیم کو محشی کا یہ اعتراض غلط معلوم ہوا۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظوں کو وضع کرتے اور ان کے اندر معنی داخل کرتے کس نے دیکھا ہے۔ زبان میں لفظ جس معنی کے لیے کثرت سے استعمال ہوتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ یہ اس معنی کے لیے وضع ہوا ہے۔ اور شارح اپنی توجہ کو استعمال پر نہیں کثرت استعمال پر مبنی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ جب کثرت سے ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال ہوتے نظر آتے ہیں تو ان کے لیے خاص معنوں کی تعیین کلیہ قاعدہ کے طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ کہنے کی وجہ وہی صحیح ہوئی جو شارح نے لکھی ہے کہ کسی کا خیال ہے۔ مصنف کا اپنا عقیدہ نہیں۔ اور فن بلاغت میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس رائے پر مبنی ہوگا کہ ان الفاظ کے معنی اپنے اپنے خاص ہیں۔

(۳) فعل تعجب کی نسبت ابن حاجب لکھتے ہیں "فعل تعجب وہ ہے جو تعجب ظاہر کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ اس کے دو صیغے ہیں ما فعلہ اور افعال بہ۔ مولانا جامی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اور اس کے یعنی فعل تعجب کے یا اس چیز کے جو تعجب ظاہر کرنے کے لیے بنایا گیا ہو دو صیغے ہیں۔ ایک ان میں سے صیغہ فعل ہے جس میں ما فعلہ کی سی شکل ہو"۔ میں نے اس عبارت میں کافیہ کے الفاظ عربی خط میں اور مولانا جامی کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔ اس موقع پر ملا عبد الغفور کا حاشیہ ختم ہو چکا ہے۔ مولانا عبدالحکیم شرح جامی کے لفظ لفظ کی مصلحت بیان کرتے ہیں۔ "اس کے ضمیر کا صیغہ ہے۔ مولانا جامی اس کے دو مرجع بیان کرتے ہیں۔ "فعل تعجب یا وہ جو تعجب ظاہر کرنے کے لیے بنایا گیا ہو" مولانا عبدالحکیم لکھتے ہیں۔ اس "کی ضمیر فعل تعجب کی طرف بھی عود کر سکتی ہے۔ کیونکہ احکام اسی کے بیان ہوتے ہیں اور فعل کی تعریف کی طرف بھی پھر سکتی ہے۔ کہ وہ قریب تر ہے اور اصطلاحی لفظ اور اس کے تعریفی الفاظ کا مطلب ایک ہی ہوتا

ہے۔ شارح ضمیر کو پھیرنے کے لیے ان میں سی کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس لیے دونوں مرجع کہنے پڑے۔ دو صیغے ہیں کے بعد ان میں سے ایک ”کالفظ اس لیے نہیں لکھا کہ یہ مبتدائے مخدوف ہو۔ اور ”ما فعلہ“ اس کی خبر۔ کیونکہ ”ما فعلہ“ ترکیب میں بدل یا عطف بیان بھی ہو سکتا ہے ان میں سے ایک کہنے سے مقصود صرف تشبیہ ماقبل کا مطلب بیان کرتا ہے ابن حاجب کو دو صیغے ہیں لکھ کر دونوں فعل لکھ دینے چاہیے مگر جو لکھا گیا ہے یعنی ”ما فعلہ“ صرف فعل نہیں پورا جملہ ہے۔ شارح کو کہنا پڑا کہ پورے جملے کا لانا ایک مجازی استعمال ہے ورنہ تعجب کا صیغہ محض فعل ہے۔ لیکن فعل بھی عام طور پر نہیں بلکہ وہ فعل جو ”ما فعلہ“ کی شکل میں لایا گیا ہو۔ شارح نے صرف فعل کا لفظ نہیں لکھا۔ صیغہ فعل کہا ہے۔ تاکہ سمجھا جائے کہ صرف ”ما فعلہ“ ہی فعل تعجب نہیں بلکہ ہر ایک صیغہ جو اس وزن پر ہو۔ اس طرح پر ”ان میں سے ایک صیغہ فعل ہے جس میں ما فعلہ کی سی شکل ہو۔“ اس عبارت کا ایک ایک لفظ خاص مصلحت رکھتا ہے۔

آنجناب کی دوسری تصنیف علم کلام میں ہے۔ امام نجم الدین نسفی کا ایک رسالہ عقائد اہلسنت میں تھا۔ جس کی علامہ تفتازانی نے شرح لکھی۔ رسالہ بالکل سادہ اور سلیس تھا۔ کیونکہ اسلامی اور بالخصوص اہلسنت کے عقائد میں کوئی پیچیدگی اور اشکال نہیں۔ مگر علامہ نے ہر ایک عقیدہ کا ثبوت پیش کرنے کا تہیہ کیا۔ جو عقائد دیگر مذاہب کے خلاف تھے ان کی دلائل عقلیہ اور جو فرقہ ہائے اسلامیہ کے خلاف تھے ان کے عقلی دلائل کے ساتھ نقلی ثبوت بھی پیش کیا۔ اور علم کلام کی چھوٹی سی کتاب بنادی۔ جسمانیات سے بحث ہو تو تجربہ رہنمائی کر دیتا ہے اور بات کو طول نہیں ہوتا۔ عقیدہ روحانی قسم کی چیز ہے بالخصوص وجود باری۔ حشر و نشر اور ملائکہ وغیرہ اعتقاد۔ ایسی چیزوں کے متعلق آج کل تو مانتے ہیں کہ عقلی ثبوت مل ہی نہیں سکتا۔ نہ اس کی ضرورت ہے۔ مگر اس زمانے میں ان مسائل کی عقلی بحث پر دفتر کے دفتر لکھے جاتے تھے۔ اور جو بات احساس سے بالاتر اس میں گفتگو کا دروازہ بند ہو ہی

نہیں سکتا۔ ثبوت ثبوت کے اوپر اعتراض۔ اعتراض کا جواب اور جواب الجواب سلسلہ دور تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ علامہ تو ہر ایک بات کو جلدی سے ختم کر دیتے ہیں مگر حاشیہ چڑھانے والوں نے معرکہ آرائی شروع کر دی اور طرح طرح کے فلسفہ اور الہیات کے مسائل معرض بحث میں آئے۔ منجملہ حاشیہ نگاروں کے ایک مولانا خیالی ہیں جو ہر بات کے اندر سے باریک نکات نکالنے میں کمال رکھتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں دو لفظی۔ اس کتاب کی فلسفہ تراشی اور مختصر نویسی نے عجیب پسندیدگی حاصل کی کہ نصاب میں داخل ہوئی۔ اور اس پر بھی کئی حاشیہ چڑھے۔ چنانچہ قلم احمد اور چند وغیرہ وغیرہ کے علاوہ ہمارے مولانا عبدالحکیم نے بھی اس پر قلم اٹھایا۔ قبولیت کچھ کمال ذاتی پر منحصر ہے کچھ خدا داد۔ مولانا عبدالحکیم کا حاشیہ خیالی کا سب سے بہتر حل سمجھا گیا۔ اور درس میں شامل ہوا۔ کسی نے کہا ہے خیالات خیالی بس بلندست نہ دروے جائے قل احمد نہ چندست مگر عبدالحکیم از رائے عالی رہا کرد از خیالات خیالی ایک اور بھی ڈھیلی ڈھالی بندش کا شعر کسی کا مشہور ہے:

خیالات خیالی بس عظیم ست برائے حل او عبدالحکیم ست
 میں اس ذکر سے اس اہتمام شان اور قدر و منزلت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو
 تعلیمی حلقوں میں ان دونوں عجیب تصنیفوں کو حاصل تھا۔ مگر زمانہ بدل گیا۔ اصول موضوعہ
 اور مسلمات عقلیہ کچھ سے کچھ ہو گئے تو جو دلائل حال کے مسلمات پر مبنی نہ ہوں اب ان کا
 کیا وزن؟ اس لیے میرے اپنے خیال میں اب وہ تارہ بودھی بڑی حد تک بیکار ہو چکا ہے
 جو علامہ تفتازانی نے تیار کیا تھا۔ تو ان کے متعلق جرح و قدح اور اعتراض و جواب کی
 ضرورت کہاں۔ اگر میرا قول صحیح ہو تو آجکل کی نسل حاشیہ خیالی اور اس کے ضمیمہ جات کو تفسیر
 طبع اور عقلی بحث میں روشن حلقوں کی بلند پروازیاں دیکھنے کے لیے مطالعہ کرے تو مضائقہ
 نہیں۔ ورنہ مفید فن کلام کے متعلق معلومات میں اضافہ کرنے کی توقع ان تحریروں سے

بہت کم ہے۔ البتہ علامہ تفتازانی کی کتاب یعنی شرح عقائد نسفی عقائد اہلسنت کی مکمل واقفیت حاصل کرنے کے لیے اب بھی مفید ہے۔ بالخصوص فرقہ ہائے اسلامیہ کے مختلف فیہ مسائل نقلی استدلال اور نقلی بحثیں اکثر نفیس اور دلچسپ واقع ہوئی ہیں۔

غرض جہاں تک میں سمجھا ہوں۔ مولانا خیالی اور مولانا عبدالحکیم کی یہ کوششیں گذشتہ زمانہ کے لیے نہایت مفید۔ نہایت کارآمد اور نہایت بر محل تھیں۔ اور اپنے وقت میں بڑا کام کر چکی ہیں۔ مگر اب ان کی میعاد ختم ہو گئی۔ اور سب نہیں تو ان کا بیشتر حصہ تقویم یا رینہ کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ یہاں ان بحثوں کے چند نمونے درج کرتا ہوں کہ آخر ہمارے بزرگوں کا تبرک ہے ناظرین کو اس سے شناسائی تو ہونی چاہئے۔

(۱) اس زمانے کے علمائے اسلام کا ایک سب سے بڑا اختلاف فلسفیانہ خیال والون سے ہیولے و صورت اور اجزائے لاجزائے کا تھا۔ حکماء اجسام کو ہیولے و صورت سے مرکب مانتے تھے۔ ان دونوں کو قدیم کہتے تھے۔ اور اسی بنا پر افلاک اور ان کی حرکات کو قدیم جانتے تھے۔ اور کئی طرح کے ایسے خیالات قائم کرتے تھے جو عقائد اسلام کے خلاف تھے۔ ان تمام مباحث کو شیخ و بن سے برباد کرنے کے لئے علمائے اسلام نے ہیولے و صورت کے وجود سے انکار کیا۔ اور اجسام کی ترکیب ایسے اجزاء سے تسلیم کی جو عقلاً اور دہماً اور فرضاً کسی طرح بھی تقسیم نہ ہو سکیں۔ عقلاً اور دہماً اور فرضاً کی قید علمائے کلام کی ایجاد تھی۔ اس کو چھوڑ کر یہ مسئلہ وہی ہے جو آجکل بھی مانا جاتا ہے۔ کہ اجسام چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہیں۔ غرض ایک زمانے میں یہ بحثیں بہت عروج پر تھیں۔ انکا پورا تماشادیکھنا ہو تو کوئی شرح مواقف اور ادھر صدر شیرازی کی شرح ہدایت الحکمتہ دیکھے کہ ایک طرف جزاء لا یجزے کے اثبات پر۔ اور دوسری طرف اس کے تردید میں فلسفہ اور ریاضی کے کیسے کیسے زور خرچ ہوتے ہیں۔ شرح عقائد میں اس کا مختصر سا تذکرہ آیا ہے اور میانہ روی کے ساتھ دونوں طرف کے دلائل کو کمزور کہہ کر اور حکماء کا مذہب ماننے سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں

ان کو لکھ کر بات کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن ایک جگہ اجزاء کو مان کر یہ بحث کی ہے کہ جسم بننے کے لئے کم از کم کتنی اجزاء کا ہونا ضرور ہے۔ ایک یہ خیال لکھا ہے کہ دو جزوں کے ملنے سے بھی جسم بن سکتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کم از کم تین اجزاء ہونی چاہئیں تا طول۔ عرض اور عمق تینوں العباد پائے جائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کم از کم آٹھ اجزاء ہونی چاہئیں کہ طول۔ عرض اور عمق زاویہ قائمہ پر تقاطع کر سکیں۔ مولانا خیالی اور مولانا عبدالحکیم نے ان بحثوں کو خوب خوب رنگین کیا ہے۔ سب کے ذکر میں طول ہوگا۔ جسم بننے کی بحث میں مولانا خیالی تقاطع العباد کے لئے آٹھ اجزاء کی ضرورت پر اعتراض کرتے ہیں کہ تقاطع چار اجزاء کے ملنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کہ دو چیزیں پاس پاس رکھیں جائیں۔ ان میں سے ایک کے پہلو میں تیسری رکھ دو تیسری کے اوپر چوتھی۔ ہمارے مولانا عبدالحکیم اس اعتراض کی تشریح کرتے ہیں۔ اور ایک غلطی مولانا خیالی سے بھی ہو گئی ہے اس کو ظاہر فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ الف اور ب کو پاس رکھنے سے طول ہو گیا۔ ب کے پہلو میں ج رکھنے سے عرض ہو گیا۔ اور ب کے اوپر درکھنے سے عمق ہو جائے گا۔ اور تینوں السباد نقطہ ب پر ایک دوسرے سے ملیں گے اور زاویہ قائمہ بنائیں گے۔ یوں تو بے شک چار اجزاء کے ملنے سے العباد کا تقاطع ہو گیا۔ لیکن مولانا خیالی جو کہتے ہیں کہ دو کے پہلو میں تیسری اور اس پر چوتھی۔ یعنی الف ب میں سے ب کے پہلو میں ج اور ج کے اوپر د۔ اس صورت میں طول۔ عرض اور عمق تو پیدا ہو جائے گا مگر ان کا ایک نقطہ پر تقاطع نہ ہو سکے گا۔

(۲) معتزلہ اور اہلسنت میں ایک اختلاف یہ ہے کہ معتزلہ انسانی افعال کو خود انسان کا مخلوق مانتے ہیں۔ اور اہلسنت کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال کو کسب کرتا ہے مگر پیدا ان کو بھی خدا ہی کرتا ہے۔ علامہ تفتازانی اہلسنت کی ایک دلیل یہ لکھتے ہیں کہ اگر انسان اپنے افعال کا خالق ہو تو اس کو اپنے فعل کی تمام تفصیل کا علم ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو چیز اپنی قدرت

اور اختیار سے پیدا کی جائے وہ علم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کئی سکون ہوتے ہیں۔ کئی حرکتیں ہوتی ہیں۔ حرکت کبھی تیز ہوتی ہے کبھی آہستہ جس کا ہمیں شعور تک نہیں ہوتا۔ اس کے سوا جسم کے اندر عضلات اور اعصاب جو چلنے یا پکڑنے یا جھپٹا مارنے میں حرکات صادر کرتے ہیں وہ ہمارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہوتی ہیں تو ہم کو ان کا علم کہاں۔ اور علم نہیں تو ہم نے انہیں پیدا کیونکر کیا۔ مولانا خیالی اس موقع پر زیادہ بحث نہیں کرتے صرف دلیل کا تمہہ بیان کر دیتے ہیں کہ خالق ہونے کے لئے تو ایسے علم کی ضرورت ہے جو موجود نہیں مگر انسان کا کسب مانا جائے تو کسب کے واسطے اجمالی ارادہ اور علم کافی ہے جو موجود ہوتا ہی ہے۔ مثلاً ہم چلنے کا ارادہ کرتے ہیں اور علم ہوتا ہے کہ اب چلنے لگے ایک طرح کی حرکت شروع کر دیتے ہیں اس کے ضمن میں جو حرکات و سکنات اور عضلات و اعصاب کا فعل ضروری ہے اور خدا کی طرف سے خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے۔ مولانا عبدالحکیم پہلے اس دلیل کو اپنے الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔ پھر کسی کی طرف سے اعتراض کرتے ہیں کہ اول تو خلق اور کسب میں ایسا فرق ثابت کرنا دشوار ہے کہ ایک کے لیے علم کا ہونا ضروری ہو اور دوسرے کے لئے نہ ہو۔ اور اگر ایسا فرق مان بھی لیا جائے تو معتزلہ کہہ سکتے ہیں کہ تفصیل کا علم ایسی مکمل تخلیق کے لیے ضروری ہے۔ جیسی تخلیق خدا کرتا ہے۔ لیکن بندہ کی تخلیق جیسی ناقص اور ادھوری ہے ایسا ہی ناقص سا علم بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اس اعتراض کا خود ہی جواب دیتے ہیں کہ تخلیق کے معنی کسی خاص چیز کو عدم سے وجود میں لانا ہے۔ اور کسب کے معنی میں موجود چیز سے کام لینا۔ معدوم کو موجود اسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مقدار۔ اس کی شکل۔ اس کے شروط و لوازم سب کا علم ہو۔ مگر موجودہ چیز سے کام لینے میں ایسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ پس تخلیق ناقص ہو۔ یا کامل جب اسے تخلیق مانا گیا تو اس کے لئے مفصل علم سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۳) اصطلاحی الفاظ کی تعریف میں بحث کو طول دینے سے اس زمانہ کے طلبائے مدارس آشنا نہیں ہیں۔ مثلاً وہ فن مکینکس میں حرکت کی تعریف ہمیشہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں دیکھتے ہیں کہ متحرک اس جسم کو کہتے ہیں جو اپنی جگہ بدل رہا ہو۔ اس تعریف کے جامع مانع ہونے یا نہ ہونے کی بحث مکینکس میں کبھی نہ دیکھیں گے۔ ہاں میافزکس یعنی علم مابعد الطبعیہ میں اب بھی ایسی بحثیں ہوتی ہیں مگر ہمارے طلباء کا مطالعہ وہاں تک پہنچتا کم ہے۔ مثلاً حرکت ہی کے متعلق وہاں بحث ہوتی ہے کہ وہ صرف جگہ ہی کے بدلنے کا نام ہے یا حالت کے بدلے کو بھی حرکت کہہ سکتے ہیں۔ کوئی اختلاف حالت کو بھی حرکت کا نام دیتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ حالت کا اختلاف ہوتا ہی اندرونی ذرات کی حرکت سے ہے۔ اس لیے اختلاف حالت میں بھی فی الحقیقت ذرات کے جگہ بدلنے ہی سے حرکت کا نام آسکتا ہے۔ ایسی یا اس سے ملتی جلتی بحثیں ہمارے علماء ہر اصطلاح کی تعریف میں کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر حرکت و سکون کا ذکر آ گیا ہے تو علماء تفتازانی فرماتے ہیں کہ چیز ضرور کسی نہ کسی جگہ میں ہوگی۔ پس اگر اس سے پہلے لمحہ میں بھی اسی جگہ تھی تو وہ ساکن ہے۔ اور اگر پہلے لمحہ میں اس جگہ کے اندر نہ تھی کسی اور جگہ میں تھی تو متحرک ہے۔ یہی مطلب ہوتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ دو لمحوں میں دو مکانوں کے اندر ہونے کو حرکت کہتے ہیں۔ اور دو لمحوں میں ایک مکان کے اندر ہونے کو سکون۔ اس پر ہمارے دونوں محشی بڑی بڑی بحثیں کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا خیالی ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ایک چیز پہلے لمحہ میں ایک جگہ ہے۔ دوسرے لمحہ میں بھی وہیں ہے تیسرے لمحہ میں دوسری جگہ چلی گئی ہے۔ تو دوسرے لمحہ میں اس کو متحرک سمجھو گے یا ساکن؟ مولانا عبدالحکیم اس اعتراض کی توضیح کرتے ہیں۔ پھر جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ چیز پہلے دو لمحوں میں ایک مکان کے اندر تھی۔ اس لئے ان دونوں لمحوں میں اس پر سکون کی تعریف صادق آتی ہے۔ لیکن دوسرے اور تیسرے لمحہ کو دیکھو

تو ان دونوں میں اس نے مکان کو بدلا ہے۔ اس لئے ان دونوں لمحوں میں حرکت کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس صورت میں دوسرا لمحہ اس پر ایسا گذرتا ہے جس میں حرکت اور سکون دونوں کی تعریف صادق آتی ہے مگر بات یہ ہے کہ ”دو لمحوں میں دو مکانوں کے اندر ہونے“ کو حرکت کہنا علامہ تفتازانی کے اپنے الفاظ نہیں ہیں۔ کسی اور کے الفاظ ہیں۔ اور ان الفاظ میں جو بے پروائی برتی گئی ہے اُس کو دور کرنے کے لیے علامہ نے پہلے اپنے الفاظ میں تعریف کی۔ اور بعد میں کہہ دیا کہ اس کہنے والے کا بھی اصل مطلب یہی ہے۔ اور جو الفاظ علامہ نے استعمال کئے ہیں وہ صاف ہیں۔ ان کے رو سے پہلے لمحہ کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بعد دوسرے لمحہ میں جو حالت ہو اس کو حرکت یا سکون کہتے ہیں۔ پس جو چیز ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ میں اسی جگہ ہے وہ ساکن ہے اور دوسرے کے بعد تیسرے لمحہ میں کہیں اور جگہ چلی گئی ہے تو تیسرے لمحہ میں متحرک ہے۔ اس تعریف پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

آپ کی تیسری تصنیف منطق میں ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ رسالہ شمسہ منطق کی چھوٹی سے کتاب ہے۔ اگرچہ مجمل مگر مسائل فن کیلئے کافی ودانی۔ اسپر علامہ قطب الدین شیرازی نے شرح لکھی۔ علامہ۔ علامہ ہونے کے علاوہ زبان عرب کے انشا پرداز بھی ہیں زبان شستہ۔ بیان سلیس۔ طرز ادا صاف سہل۔ ان کی یہ کتاب جو قطبی کے نام سے مشہور ہے اس فن کی درسی کتابوں میں بہترین تصانیف کہلانے کی مستحق ہے اور جو اختلاط مسائل فلسفہ اور دیگر فنون کا اس زمانے کی کتابوں میں عام ہے قطبی اکثر و بیشتر اس سے مبرا ہے۔ اس پر میر سید شریف کی توجہ مبذول ہوئی۔ انہوں نے حاشیہ لکھا خواجہ میر دشوار یوں کی عقدہ کشائی میں مشاق ہیں۔ ان کا کلام بھی چچیدگی سے پاک ہونا چاہئے اور ہے۔ لیکن معقولات کی بحث ایسی صاف ہو ہی نہیں سکتی جیسی فن تاریخ یا دیگر علوم کی۔ یہاں تقریر کیسی واضح ہو۔ ضرور کہیں نہ کہیں اشکال اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا عبدالحکیم کی طبع رسا

ایسی دشواریوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ کہیں ملیں تو حل کریں۔ انہوں نے حاشیہ لکھا۔ جس میں قطبی اور میر قطبی دونوں کے مقامات کو واضح کیا۔ منطق کی ایک مکمل کتاب کے سمجھنے میں جو دقتیں تھیں وہ سید شریف اور ہمارے مخدوم کی کوشش سے رفع ہوئیں۔ اور وہ باریک نکات۔ لطیف معلومات اور نفیس بحثیں اکثر اسی کتاب میں ہیں جنہوں نے مولانا عبدالحکیم کو قواعد لسانیہ کے ساتھ معقولات میں بھی مشہور عالم کیا۔ اور میرزا ہد سے ٹکرایا۔ مولانا جہاں قطبی کی تحریر پر حاشیہ لکھتے ہیں وہاں قال اور جہاں میر کی تحریر پر لکھتے ہیں وہاں قولہ کے لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ حاشیہ کے پہلے دوثلث میں زیادہ تر میر کی اور ثلث آخر میں بیشتر قطبی کی تشریح ہے۔ اب میں مضمون کتاب کے چند نمونے جو نسبتاً نہایت آسان اور سربلغ الفہم ہوں۔ درج کرتا ہوں۔

(۱) منطق میں کس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے دلیل مرتب کرنے کے قاعدے بنائے جاتے ہیں۔ یا کسی امر کو واضح کرنے کے لیے اس کی تعریف کرنے کے قوانین۔ جن الفاظ سے کسی اور امر کا تصور ذہن میں لایا جاتا ہے اس کو معرف کہتے ہیں۔ علامہ شیرازی معرف کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ کسی چیز کا معرف وہ ہے جس کے تصور کرنے سے ذہن میں لازمی طور پر اس چیز کا تصور آجائے۔ یا وہ چیز اور سب چیزوں سے ممتاز ہو جائے معرف سے چیز کا تصور مکمل طور پر پیدا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ کسی نہ کسی طرف کا اجمالی تصور بھی کافی سمجھا جائے۔ میر سید شریف فرماتے ہیں کہ متاخرین اہل منطق کے نزدیک ضرورت ہے کہ معرف چیز کی حقیقت کو واضح کرے۔ یا اس کو تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کر دے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حقیقت کو واضح کرنا یا تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کرنا معرف کے لئے ضرور نہیں ہے۔ اور جو الفاظ کسی چیز کو بعض دیگر اشیاء سے ممتاز کریں وہ بھی معرف کے تحت میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح کسی چیز کی حقیقت واضح کرنے کے لئے یا اسے تمام دیگر اشیاء سے ممتاز

کرنے کے لیے معرف کی ضرورت ہے اسی طرح کسی چیز کو بعض دیگر اشیاء سے ممتاز کرنا بھی ایک کام ہے اور معرف کا محتاج ہے۔ پس اجمالی علم پیدا کرنے والے الفاظ کو بھی معرف کہنا چاہئے۔ میر صاحب نے کہنے کے لائق بات فرماتا تو دی مگر اپنے استدلال کا بنیادی جملہ چھوڑ گئے۔ مطلوب یہ تھا کہ حقیقت کو واضح کرنا یا تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کرنا بیشک ایک ضرورت ہے۔ جس کو پورا کرنے کے قاعدے مقرر ہیں۔ مگر دنیا میں بعض چیزوں کا محض اجمالی علم بھی ہوا کرتا ہے اور کبھی صرف اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے کہ چیز کو بعض اشیاء گرد و پیش سے ممتاز کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو برلانی کے بھی قاعدے مرتب ہونے چاہئیں۔ اور ایسے قواعد کا بتانا علم منطوق کا فرض ہے۔ تو اجمالی علم کے قواعد بھی اسے سکھانے ہوں گے۔ پس ایسے الفاظ جو کسی چیز کا اجمالی علم دین معرف کے ضمن میں داخل سمجھ کر ان کے قواعد پر بھی بحث ہونی چاہئے۔ ورنہ یہ فن نامکمل رہے گا۔ دلیل کا یہ حصہ مولانا عبدالحکیم نے پورا کیا اور بات صاف ہوئی۔

(۲) مدعا کو بیان کرنے یا دلائل کو ترتیب دینے میں جو جملے استعمال ہوتے ہیں ان کو قضایا کہتے ہیں۔ منطق میں قضایا کی بڑی لمبی تعریف مصنف شمس نے یوں کی ہے کہ ”اگر قضیہ میں یہ کہنا صحیح ہو کہ مسند الیہ مسند ہے تو وہ قضیہ موجبہ ہے۔ جیسے انسان ایک حیوان ہے۔ اور اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ مسند الیہ مسند نہیں ہے تو وہ سالبہ ہے۔ جیسے انسان پتھر نہیں ہے“ علامہ شیرازی کہتے ہیں کہ یہ تعریف قضایا کے کاذبہ پر صادق نہیں آتی۔ مثلاً اگر کہا جائے۔ انسان پتھر ہے تو یہ ایسا جملہ ہے۔ جس میں مسند الیہ کو مسند کہنا صحیح نہیں۔ حالانکہ قضیہ موجبہ یہ بھی ہے۔ گو اس کے اندر کا دعویٰ غلط ہے اس اعتراض کے بعد وہ موجبہ اور سالبہ کی تعریف اپنے طور پر کرتے ہیں۔ مگر میر سید شریف فرماتے ہیں کہ صحیح ہونے سے واقعی صحیح ہونا مراد ہو تو بیشک شمس کی تعریف غلط ہے لیکن اگر صحیح ہونے سے ایک عام مراد لی جائے کہ مسند الیہ کا

مسند ہونا واقع میں صحیح ہو یا کہنے والے کے خیال میں تو پھر تعریف میں کوئی غلطی نہیں۔ جو شخص کہتا ہے کہ انسان پتھر ہے وہ اپنے خیال میں انسان کو پتھر ہی سمجھتا ہے۔ پس اس کے نزدیک صحیح ہے کہ مسند الیہ مسند ہے۔ مولانا عبدالحکیم کہتے ہیں کہ جو غلط جملے صحیح سمجھ کر بولے جائیں ان کے لئے تو بیشک سید صاحب کا عذر معقول ہے۔ لیکن جب بولنے والا جان بوجھ کر جھوٹ بولے قضیہ اس وقت بھی موجب یا سالبہ ہوتا ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتے کہ واقع میں یا کہنے والے کے نزدیک وہ اظہار صحیح ہے۔ ہاں صحت کی تعریف اور وسیع کرو کہ وہ اظہار واقع میں صحیح ہو یا کہنے والے کے نزدیک صحیح ہو یا بظاہر صحیح اظہار کے طور پر ادا کیا گیا ہو۔ تو اس صورت میں بیشک سب قسم کے قضایا اس تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ آگے علامہ تفتازانی کی رائے نقل کرتے ہیں اور اس پر بھی ایک اعتراض کر دیتے ہیں۔

(۳) مصنف شمسہ قیاس یعنی دلیل کی تعریف میں لکھتا ہے کہ وہ ایک عبارت ہوتی ہے کئی جملوں سے مرکب اور ایسی کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو ضروری ایک اور جملہ کو جسے نتیجہ کہتے ہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ علامہ شیرازی فرماتے ہیں کہ ”جملوں کا لفظ جمع کی شکل میں اس لئے لایا گیا ہے کہ دلیل کبھی دو جملوں سے مرکب ہوتی ہے جس کو قیاس بسیط کہتے ہیں۔ اور کبھی دو سے زیادہ جملے لانے پڑتے ہیں۔ اسے قیاس مرکب کہتے ہیں۔“ ان الفاظ پر سید صاحب کا حاشیہ ہی نہیں۔ مولانا عبدالحکیم علامہ تفتازانی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کہ جہاں تک دیکھا گیا اور استقراء صحیح سے ثابت ہو دلیل دو ہی جملوں سے مکمل ہو جاتی ہے۔ چھڑی بانس کی ہے اور بانس تیر سکتا ہے۔ بس دلیل اتنی ہی ہوتی ہے اور نتیجہ دیتی ہے کہ چھڑی تیر سکتی ہے۔ لیکن کبھی یہ دونوں جملے یا ان میں سے ایک خود کسی دلیل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور کبھی ان کی دلیلیں بھی کسی اور دلیل کی محتاج ہوتی ہیں اور ایسا سلسلہ کبھی لمبا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک مسلمات یا بدیہیات تک نہ پہنچ جائے ختم نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر تمام جملوں کو باہم ملا کر

بیان کرنے سے خیال گزرتا ہے کہ دلیل کئی جملوں سے مرکب ہے۔ مگر حقیقت میں وہاں ایک دلیل ہوتی ہی نہیں۔ آگے پیچھے کئی دلیلیں ہوتی ہیں اور ہر ایک دلیل دو جملوں سے مرکب۔ پس قیاس مرکب کوئی چیز نہیں۔ قیاس بسیط ہی ہوتا ہے جس میں دو سے زائد جملہ ہو نہیں سکتے۔“

یہ مختصر تذکرہ ان زرین کارناموں کا ہے جو خطہ پنجاب کو روشن کرنے والے۔ اور یہ شہر سیالکوٹ اور لاہور کو علمی دنیا میں درد زبان بنانے والے ہمارے مخدوم مولانا عبدالحکیم کے مبارک ہاتھوں اور ہمہ گیر قلم سے منصفہ ظہور پر آئے۔ زمانہ نے رفتار بدل لی۔ اسلامیوں سے علم و حکمت کا مزاق دور ہو گیا۔ بزرگوں کا نام اور ان کا کام چند پرانی روحوں کے پاس فرسودہ جسموں کے اندر دماغوں کے خلوت خانہ میں بند ہے یا کبھی کبھار زبان تک آ کر بیرونی دنیا کی سامعہ خراشی کر جاتا ہے۔ یہ روحیں سفر کر جائیں گی۔ یہ جسم دفن ہو جائیں گے تو ان کا بھی خدا کے سوا کون ہے؟ وہ اپنے فضل سے آئندہ نسلوں کو بیدار کر دیے اور ترکہ اسلاف کی قدر شناسی کا میلان دیدے تو اور بات ہے ورنہ موجودہ حالت زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔



تکملہ

ملا عبد الحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق اس تکملہ میں تین چیزوں کا تذکرہ کیا

جاتا ہے۔

(۱) صاحبان علم و دانش کے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

کے بارے میں کلمات تحسین

(۲) آپ کی تصانیف

(۳) آپ کے تلامذہ

(1)

آپ کو مختلف لوگوں کی طرف سے جو القابات ملے درج ذیل ہیں

(i) آفتاب پنجاب : (یہ خطاب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا)

(ii) ملک العلماء : (یہ خطاب شاہجہان نے دیا)

(iii) دقیقہ سنج محقق، سرخیل علمائے واجب التعظیم: (محمد صالح کنبوہ)

(iv) فاضل لاہوری : (ملاحمد اللہ)

کلمات تحسین

مختلف صاحبان علم نے آپ کے علم و فضل کے بارے میں جو تبصرہ کیا بعض کا ذکر ہو چکا، چند مزید درج ذیل ہیں۔

(i)

دارالسلطنت لاہور کے مضافات کا قصبہ سیالکوٹ اُن کی ولادت گاہ ہے۔ علم و فضل کے سبب انہیں اتنی شہرت حاصل ہے کہ تعارف کی حاجت نہیں۔ اگر اُن کو بوعلی سینا اور ابو نصر فارابی کا ہمسر ٹھہرایے تو بجا ہے اور عقول عشرہ کی صف میں جگہ دیجئے تو زیبا۔ آغاز عمر ہی میں مبداء فیاض کی عنایت سے تمام علوم و فنون پر حاوی ہو گئے۔ خداداد کمالات اور ذکاوت و ذہانت کے سبب علمائے قدیم کی تمام کتابوں پر جن کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہے، حواشی لکھے اور ہر ایک کے دیباچے کو حضرت شاہجہاں بادشاہ کی ذات گرامی سے معنون کیا۔ ساٹھ سال تک درس و تدریس کر کے شریعت اسلامی کے فرائض، سنتوں اور مسائل کی تلقین کرتے رہے۔ رسول کریم ﷺ کے دین کی تعلیم اور اپنی ذات حمیدہ صفات کی برکت سے پنجاب بلکہ سارے ہندوستان کو فیض پہنچایا۔ رفتہ رفتہ اُن کے علم کا درجہ یہاں تک پہنچا کہ بڑے بڑے عالم فاضل اُن کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے اور باکمال ادیب طفلان مکتب کی طرح صف بستہ ہوتے۔ ہر شخص اعتراف کرتا کہ خطہ یونان کا حکیم کامل ارسطو اُن کے سامنے ابجد خواں ہے۔ الغرض اُس مالک فضائل و کمالات سے تمام فاضلان زمانہ نے استفادہ کیا۔ (کنبوہ، محمد صالح، عمل صالح المعروف بہ شاہجہاں نامہ، مترجم ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۴ء، جلد ۳ ص ۸۰۶)

(ii)

خلاصۃ الاثر میں ہے

لم يبلغ احد من علماء الهند في وقته ما بلغ من الشأن والرفعة ولا انتهى واحد منهم الى ما انتهى اليه جميع الفضائل عن يدوحاز العلوم و انفراد. (خلاصۃ الاثر جلد ۲، ص ۳۱۸ بحوالہ فقہائے ہند از محمد اسحاق بھٹی، جلد ۴، ص ۵۴)

(iii)

متاخرین میں سے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

علامہ زمان و افتخار زمانیاں است. الحق در جمیع فنون درسی، مثل اواز زمین ہند بر نہ خاست. آثار دانش باین کیفیت و کمیت و حسن قبول بر صفحه روزگار نہ گزاشت۔

وہ (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) علامہ زمان اور فخر اہل زمان ہیں۔ بلاشبہ تمام اصناف علوم درسیہ میں انہیں جوسترس حاصل تھی، اس میں سرزمین ہند میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان کے لرو دانش کی کیفیت و کمیت اور دنیا میں جس قبول کے اعتبار سے کوئی ان کا ثانی نہیں گزرا۔

آزاد بلگرامی آگے چل کر ان کی علمی فیض رسائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:
وعرصہ جہان را بہ لوا مع فیض مملو ساختہ۔

انہوں نے خطہ ارض کو اپنے فیض علم و فضل کی ضیا پاشی سے بھر دیا۔ (ماثر الکرام

دفتر اول ص ۱۹۳، بحوالہ فقہائے ہند جلد ۴، ص ۵۵)

(iv)

مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی علامہ زمان سرآمد اقران خود (تذکرہ علمائے ہند ص: ۱۱۰)

بحوالہ فقہائے ہند جلد ۲ ص ۵۵)

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی علامہ عصر اور اپنے معاصرین میں سب سے فائق تر تھے۔

(v)

فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:

”وہ بڑے عالم و فاضل، فقیہ، محدث و مفسر، خصوصاً علم معقولات میں یگانہ آفاق

اور صاحب تصانیف عالیہ تھے“ (حدیقہ الحنفیہ بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد

۱۲ ص: ۸۳۷)

(vi)

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں اور بلند مرتبہ تصانیف کے لحاظ

سے دیار ہند میں ان کے کوئی مثل نہیں۔ (کشمی، محمد ہاشم، زبدۃ المقامات، مترجم ڈاکٹر غلام

مصطفیٰ خاں مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ، ۱۴۰۷ھ، ص: ۲۵۲)

تلامذہ

آپ کے تلامذہ کی تعداد یقیناً کثیر ہوگی مگر ان کے نام محفوظ نہ رہ سکے۔ محمد اسحاق بھٹی نے آپ کے تلامذہ کا مختصر تعارف نقل کیا ہے۔ وہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

(۱) قاضی عبدالرحیم مراد آبادی

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری ثم مراد آبادی اپنے عصر کے مشاہیر علماء میں سے تھے، فاضل کبیر اور دیار ہند کی نامور شخصیت تھے۔ نو سال سے زائد عرصہ مولانا سیالکوٹی کی خدمت میں رہے اور علم و فضل کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مراد آباد کی مسند قضا پر متعین کیے گئے۔ طویل مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان سے بہت سے علماء نے حصول علم کیا۔ قاضی صاحب مرحوم کا حلقہ تلمذ مشاہیر علماء پر مشتمل تھا۔

(۲) ملا عصمت اللہ سہارن پوری

تذکرہ یاغستان کے مصنف نے ملا عصمت اللہ سہارن پوری کا شمار مولانا سیالکوٹی کے تلامذہ میں کیا ہے۔ عالم کبیر، فاضل جلیل اور معروف فقیہ تھے۔ درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے مگر بقول صاحب ”تذکرہ علمائے ہند“:

در باطن چشم بصیرتِ روشن بود

ان کے باطن میں چشم بصیرت روشن تھی۔

انہوں نے کافیہ کی شرح ”القوائد الضیائیہ“ (یعنی شرح جامی) پر حاشیہ لکھا اور

شرح خلاصہ الحساب تحریر کی۔ بہت سے علماء و طلباء کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

(۳) مولوی محمد احمد قنوجی

مولانا سیالکوٹی کے تلمذہ کی طویل فہرست میں مولوی محمد احمد قنوجی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں منطق کی کتاب صدرا کا حاشیہ لائق تذکرہ ہے۔

(۴) ملا عبد الوہاب پسروری

عہد شاہ عالم کے مشہور عالم اور فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری کے جد امجد ملا عبد الوہاب پسروری نے اپنی تصنیف فرحت الناظرین میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملا عبد الوہاب پسروری شاہ جہانی عہد کے عالم تھے اور شاہ جہان ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے کئی مرتبہ ان کو وظائف و مناصب سے نوازا اور علامی نواب سعد اللہ خاں کی سعی و کوشش سے اپنے بیٹوں کے نام دو گاؤں شاہ جہان کی طرف سے قبول کیے۔ بعد میں شاہ جہان نے دو مزید دیہات کا اضافہ کر کے یہ تعداد چار تک بڑھادی تھی۔ یہ دیہات کافی عرصہ ان کے خاندان کے تصرف میں رہے، مگر سکھوں کے دور ہنگامہ میں ان کے قبضے سے نکل گئے۔

ملا عبد الوہاب پسروری نے مولانا سیالکوٹی سے فقہ و اصول اور معانی کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درس علوم دینی میں صرف کردی۔ ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا۔

(۵) مولوی محمد معظم

مولوی محمد معظم بن احمد صدیقی موضع بنہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی اور علوم دینیہ میں اپنے معاصرین سے سبقت لے

گئے۔ قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی کے ان کو حفظ تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے بہادر شاہ نے ان کو ان کے وطن بنہ کا قاضی مقرر کیا اور چند گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ عمر بھر مسند تدریس اور منصب قضا پر متعین رہے۔ صاحب تصانیف بھی تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی معرض تحریر میں لائے تھے، مگر وہ سکھوں کے دور استیلا میں نذر آتش کر دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں مثنوی مولانا روم کی شرح بھی لکھی تھی۔

(۶) ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی

مولانا عبدالکلیم سیالکوٹی کے شاگردوں میں ایک عالم دین ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی تھے۔ یہ مولانا عبدالرشید کے بیٹے تھے، جن کا شمار اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ ملا عبدالعزیز عزت عنقوان شباب ہی میں حصول علم سے فارغ ہو کر درس و افادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور اپنے وطن اکبر آباد میں مسند تدریس پر فائز تھے۔ ان کی علمی خوبیوں کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں اکثر ان کا تذکرہ ملتا اور بادشاہ ان کی تعریف کرتا۔ ان کے بعض رسائل و مسودات بھی بادشاہ کی نظر سے گزرے تھے۔ جنہیں دیکھ کر وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ان کو دربار میں طلب کر کے ”مورد انواع عاطفت“ فرمایا اور ”منصب عمدہ و خدمت عرض مکرر“ کا امتیاز بخشا۔ عالم گیر ان کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کی ”توجہات روز افزوں“ ان کو حاصل تھیں۔

ملا عبدالعزیز بہت اچھے شاعر بھی تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔

(۷) ملا محمد افضل جون پوری

ملا محمد افضل جون پوری، اپنے عصر کے علامہ زمان و افتخار زمانیاں تھے۔ فنون درسیہ میں مہارت رکھتے تھے، درسیات میں جو فضل و کمال ان کو حاصل تھا، وہ اس عہد کے

علمائے جن پور میں اس کسی کو حاصل نہ تھا۔ معاصرین میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے دل ان کی عزت سے معمور تھے۔ جون پور سے لاہور آئے اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حلقہٴ درس میں شمولیت کی۔ کئی سال ان کی خدمت میں رہے اور علوم مروجہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن جون پور کو مراجعت کی۔ جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علم تشنگی بجھائی۔ یہ ہندوستان میں جہاں گیر کا عہد تھا۔ وہ ان کی بہت تکریم کرتا تھا، اور انہیں ”استاد الملک“ کے خطاب سے نوازا تھا۔ مدرسہ شاہی میں تدریس کے فرائض بھی ان کے سپرد تھے۔ ان کے لیے جاگیر بھی مقرر کی تھی۔

(۸) مولانا عبد اللہ لیبیب

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ایک شاگرد خود ان کے بیٹے مولانا عبد اللہ لیبیب تھے، جن کے زمانہ طالب علمی میں ان کے استفادے کے لیے انہوں نے متعدد کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ یہ جلیل القدر عالم تھے۔

مولانا عبد اللہ لیبیب نے معقولات و منقولات کا علم اپنے والد مکرم سے حاصل کیا تھا اور حدیث رسول ﷺ کی تحصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند شیخ نورالحق دہلوی سے کی تھی۔

مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر مولانا عبد اللہ لیبیب کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر تھا اور ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۰۸۶ھ میں لاہور آیا تو مولانا مدوح سے ملاقات کا متمنی ہوا، اور انتہائی اعزاز و اکرام سے انہیں سیالکوٹ سے لاہور بلایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے مل کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور وہ تمام اعزازات جو ان کے والد مولانا عبدالحکیم کو حاصل تھے، ان کے لیے برقرار رکھے اور ان میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ خلعت خاص، دو سواشر فیاں اور ایک ہاتھی دے کر انہیں رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق اورنگ زیب نے انہیں اجمیر بلایا اور اجمیر کی صدارت
عظمیٰ پیش کرنا چاہی۔ مگر بقول بختاور خاں کے مولانا نے یہ کہہ کر بادشاہ کی پیش کش قبول
کرنے سے انکار کر دیا کہ:

الحال سین عمر ستین رسیدہ، وقت ترک نوکری است نہ اختیار نوکری۔
اب جبکہ عمر ساٹھ سال کو پہنچ گئی ہے، یہ ترک نوکری کا وقت ہے، نہ کہ نوکری
اختیار کرنے کا۔

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک خط کے ذریعے مولانا
عبداللہ لیب کو یہ پیش کش کی تھی اس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

ان الزمان زمان الفراق

کہ اب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

مرآة العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ لیب، گوشہ نشین عالم دین
تھے اور ارباب حکومت سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

حفظ کلام مجید و قلت اختلاط بارباب دول و رغبت طبع با نزا و گوشہ نشینی بروالد ماجد
خود مزیت داشت۔

یعنی وہ قرآن مجید ک حفظ اور اصحاب حکومت سے عدم رغبت و قلت اختلاط کے
اوصاف سے متصف تھے اور ارباب دولت سے ملنے کے بجائے علیحدگی و گوشہ نشینی کو ترجیح
دیتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے والد (مولانا عبدالکیم) پر فوقیت رکھتے تھے۔

اس عظیم المرتبت عالم نے اورنگ زیب عالم گیر کے چھبیسویں ۲۶ سال جلوس
میں ۱۰۹۳ھ کو وفات پائی۔

مولانا عبداللہ لیب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالکیم نے ان کی جگہ سنبھالی اور ان کی خدمت میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کی۔

حیات و خدمات سیالکوٹی کے مآخذ

- (۱) Mulla Abd al Hakim fo Sialkot; his life and work
- یہ ایٹن اللڈویشر کا مقالہ، پی ایچ ڈی کے لئے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۱۹۶۹ء میں پیش کیا گیا۔
- (۲) مآثر عالمگیری (محمد ساقی مستعد خان)
- (۳) بادشاہ نامہ (عبدالحمید لاہوری)
- (۴) الثقافة الاسلامیہ فی الہند (عبدالحی الحسنی)
- (۵) سیاحت ہند (عبدالرحمن امرتسری)
- (۶) مرآة العالم (بخٹاور خان)
- (۷) رود کوثر (ایس ایم اکرام)
- (۸) علمائے ہند کا شاندار ماضی (محمد میاں)
- (۹) ہدیۃ العارفین (اسماعیل پاشا)
- (۱۰) الاعلام (زرکلی جلد ۲)
- (۱۱) پاکستان میں فارسی ادب
- (۱۲) دانشنامہ ادب فارسی (ایڈیٹر حسن انوشہ)
- (۱۳) نگاہی بہ تاریخ ادب فارسی در ہند
- (۱۴) Dictionary of Indo-Persian literatvre
- (۱۵) ملا عبدالحمید سیالکوٹی (مقالہ برائے ایم اے از رفعت قریشی ۱۹۶۹ء)



تصانیف

آپ کی تصانیف کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا۔
عبدالحق الحسنی عبدالحکیم سیالکوٹی کو ”صاحب التصانیف الفائقہ والتالیف
الرائقة“ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

ویدرس ویصنف و تصانیفه کلها مقبولة عند العلماء محبوبة
اليهم ولا سيما عند علماء بلاد الروم تینافسون فيها وهي جريرة بذلك
مولانا عبدالحکیم فرائض تدریس انجام دیتے اور مصروف تصنیف رہتے تھے اور ان
کی تمام تصانیف حلقہ علماء میں مقبول ہیں اور وہ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بالخصوص
بلاد روم سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ان کی تصانیف سے ایک دوسرے سے بڑھ کر
رغبت رکھتے ہیں اور یہ تصانیف اس قدر افزائی کی مستحق بھی ہیں۔ (اردو دائرہ معارف
اسلامیہ اور فقہائے ہند)

محمد الدین فوق نے ان تصانیف کی فہرست دی ہے مگر وہ موضوعاتی اعتبار سے
نہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے موضوعاتی اعتبار سے درج ذیل
فہرست مرتب کی ہے۔

(الف) تفسیر میں

(۱) حواشی علی تفسیر البیضاوی، تفسیر البیضاوی کا اہم حصہ پہلی دو سورتوں کی تفسیر
ہے، اس حصے پر کئی علما نے حواشی لکھے ہیں، مگر عبدالحکیم کے حواشی اساتذہ وتلامذہ میں بہت
ہی مشہور اور متداول ہیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔
محمد محی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں لکھا ہے: ”رأيتها و طالعت فيها“

أبحاثاً دقيقة“ پروفیسر مر جلیوت (Morgoloth) کتاب Chrestomathia Baidawiana کے دیباچے میں ان حواشی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”میں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے“ (مطبوعہ)، (۲) حاشیہ علی الکشاف غیر مطبوعہ۔
(ب) فقہ میں:

(۳) حاشیہ علی التلویح، غیر مطبوعہ (۴) حاشیہ علی الحسامی (مطبوعہ)
(ج) علم کلام میں:

(۵) حاشیہ علی النخیالی (مطبوعہ)، (۶) حاشیہ علی شرح العقائد الجلالی (مطبوعہ)، (۷) حاشیہ علی شرح المواقف (مطبوعہ)،
(۸) الرسالة الخاقانیة الموسومة بالدر الثمین (غیر مطبوعہ)، (۹) زبدة الافکار (غیر مطبوعہ)
(د) علم منطق و فلسفہ میں:

(۱۰) حاشیہ علی میر قطبی (غیر مطبوعہ) (۱۱) حاشیہ علی حاشیہ مطالع النوار (مطبوعہ)، (۱۲) حاشیہ علی قطبی (غیر مطبوعہ)،
(۱۳) حاشیہ علی میبذی (غیر مطبوعہ)
(ه) صرف و نحو و معانی میں:

(۱۴) حاشیہ علی المَطُول (مطبوعہ)، (۱۵) حاشیہ علی حاشیہ عبدالغفور (مطبوعہ)

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب بھی انہیں کی تصنیف ہیں، لیکن وہ طبع ہوئیں نہ کہیں ان کا مخطوطات کی شکل میں موجود ہونا معلوم ہے

(۱) حاشیہ شرح حکمة العین، (۲) حواشی بر شرح مراح

الارواح، (۳) شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین کا ترجمہ فارسی۔
 (یہ ترجمہ دہلی سے ۱۳۰۰ھ میں چھپ چکا ہے) (۴) القول المحیط (۵) حاشیۃ
 شرح تہذیب (مندرجہ بالا شروع و حواشی کے علاوہ بھی عبدالحکیم کی بعض تصانیف و
 تالیفات کے نام ملتے ہیں) چند نام درج ذیل ہیں

(۱) اثبات الامامة (۲) زاد اللیب فی سغرا الحیب (۳) دلائل

التجدید (۴) سیلکوتی التصورات۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ اور دانشنامہ ادب فارسی جلد ۴ ص: ۱۶۸۸)

بعض تصانیف کا تعارف

محمد الدین فوق نے آپ کی تین کتب کا تعارف نقل کیا ہے محمد اسحاق بھٹی اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے بعض کتب کا تفصیلی تعارف دیا ہے جو کہ درج ذیل ہے

(۱) ملا عبدالحکیم کا حاشیہ بیضاوی:

ہندی اہل علم کا یہ وہ دور تھا جب مدارس دینیہ میں تفسیر بیضاوی کا وہ باقاعدہ درس دینے لگے تھے اور اس پر تعلیقات و حواشی کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی جو مسند تدریس پر فائز تھے اور طلباء کو تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے، اس کی شرح ضبط کتابت میں لانے کا ارادہ کیا اور اس کے مشکل و مغلق مباحث کو سلجھانے کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن کتاب چونکہ دقیق مسائل کو محیط ہے اس لیے مولانا کو معلوم تھا کہ شرح کے باوجود اس کی پیچیدہ گریہوں کی عقدہ کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار وہ مقدمہ کتاب میں ان الفاظ سے کرتے ہیں:

ان التفسیر العتیق و البحر العمیق، المسمی بانوار
التنزیل، لآمام الہمام، قدوة علماء الاسلام، سلطان
المحققین، برهان المدققین القاضی ناصر الدین عبد اللہ
البیضاوی قد استنہذ العلماء بحل مشکالاتہ واسہر
الاذکیاء احد اقہم لفتح مغلقاتہ، إلا انہ لو جازة
العبارات واحتوائہ الاشارات، جل ان یکون شریعة لكل

وارد، وان يطلع عليه الا واحد بعد واحد.

وہ تفسیر قدیم اور (علوم قرآنی کا) بحر عمیق، جو انوار التنزیل کے نام سے موسوم ہے اور محققوں کے بادشاہ اور دقیقہ سنجوں کی برہان قاضی ناصر الدین عبداللہ بیضاوی کی تصنیف ہے۔ علمائے نامدار اس کے مشکل مباحث کی عقدہ کشائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور اذکیائے دوراں نے اس کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت کے لیے اپنی آنکھوں کو شب بیداری کرائی ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنی عبارتوں کے ایجاز کی وجہ سے اور اشارات علمیہ پر محتوی ہونے کے باعث، اس سے کہیں بلند ہے کہ ہر اترنے والے کے لیے پانی کا گھاٹ بن جائے (یعنی ہر شخص کے فہم کی گرفت میں آ جائے) اور یکے بعد دیگرے سب لوگ اس کے دقائق و غوامض پر مطلع ہو جائیں۔

مولانا سیالکوٹی چوں کہ بہت بڑے عالم اور وسیع المطالعہ شخص تھے، اس لیے انہیں ذاتی طور پر یقین تھا کہ تفسیر بیضاوی کے غوامض و مغلقات کے حل و کشود سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں لیکن اس سے تعلق رکھنے والے اہل علم ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے متامل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ صرف ان کی زبانی باتیں ہیں عملاً اس عظیم کام کی تکمیل بہت مشکل ہے۔ ان لوگوں نے مولانا ممدوح سے بیضاوی کے مغلقات کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ان کے جواب کے طالب ہوئے۔ مولانا نے ان کو تسلی بخش جواب دیے۔ تحریر فرماتے ہیں:

فقلت لهم ايها الاخلاق الدينية والاخوان الروحانية، اني

انسست ناراً بوادي هذا الكتب، اتيكم منها بقبس لعلكم

تصطلون، فاستكشفوا منى بعض مظان لبسه فغرضت
 لهم ماورد في خلدہ عند درسه من حل يفيد بر دقلوب
 اولی الابصار و زيادات وقعت الظفرة عنها.

میں نے ان سے کہا، اے دینی دوستو اور روحانی بھائیو! میں نے
 اس کتاب کی وادی میں آگ دیکھی ہے۔ میں اس سے کچھ انگارے
 لاتا ہوں تا کہ تم اس سے تاپ سکو۔ اب انہوں نے مجھ سے
 درخواست کی کہ اس کی بعض ان مقامات کی وضاحت کروں، جہاں
 شکوک و شبہات کا خیال ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے سامنے وہ فوائد
 علمی پیش کیے جو اس کتاب کا درس دیتے وقت میری سطح قلب پر
 ابھرے تھے۔ یہ ان مشکل مسائل کے ایسے حل تھے جس سے اہل علم
 اور اصحاب عقل کے دلوں کو ٹھنڈک اور تسکین پہنچتی ہے۔ یہ حال ان
 زیادات و افادات کو محیط تھے، جن پر مجھے دسترس ہوئی۔

مولانا نے جب یہ دعویٰ کیا اور مغالقات کی توضیح و تشریح کے بارے میں ایک
 بات کہی تو ہر طرف کے اہل علم ان سے عرض کناں ہوئے کہ ان مقامات کی وضاحت فرمائی
 جائے۔ لیکن غربت و تنگ دستی اور مال و مکان کی تنگی احباب کی اس خواہش و تمنا کی راہ میں
 رکاوٹ بن گئی، جس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فاقر حوا ان تقيد هذه الابعد تذكرة للاحباب النظار
 فعللتهم بتفرق البال و تشتت الحال، اذا كنت مطر و حاء
 بمكان قفر جل بضاعتی فيه فقر.

انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان دقیق مسائل کو قلم بند کر دوں جو ہر

شخص کے فکر و فہم کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں، تاکہ اہل نظر احباب کے لیے وہ ایک تذکرہ ثابت ہوں۔ لیکن میں نے ان سے عدم اطمینان قلب اور پراگندگی، حال کا بہانہ کیا۔ کیوں کہ میں اس زمانے میں ایک بالکل خالی مکان میں پڑا ہوا تھا۔ جہاں میری سب سے قیمتی متاع فقر اور بے سروسامانی تھی۔

مولانا کی یہ سخت ذہنی پریشانی اور شدید مالی بد حالی کا زمانہ ہے، اور ہندوستان میں یہ جہاں گیر کا عہد حکومت ہے، جبکہ بعض دیگر فضلاء عصر اور علمائے روزگار کی طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سرکار کی نظر عنایت کی سرحدوں سے باہر اور حکومت کے گوشہ چشم التفات سے دور تھے۔ اسی لیے اپنی گونا گوں پریشانیوں کی وجہ سے تشبیہ بیضاوی تحریر کرنے سے قاصر اور اپنے ذی علم احباب کی درخواست کو شرف قبولیت بخشنے سے عاجز تھے۔ اس قسم کے خالص علمی کام دلجمعی اور سکون خاطر کی متقاضی ہوتے ہیں، لیکن وہ اس سے محروم تھے۔ جہاں گیر کے بعد شاہ جہان تخت ہند کا وارث بنا تو سرکاری سطح پر علما کے وقار و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔ مولانا سیالکوٹی نے اس سے ملاقات کی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انہیں صلوات و جوائز سے سرفراز کیا۔ اب وہ ذہنی و فکری طور پر بالکل مطمئن تھے، چنانچہ دوستوں کے تقاضوں کو عملی شکل دینے کے لیے میدان میں نکلے اور قلم ہاتھ میں پکڑا۔ فرماتے ہیں:

حتى جذب صنيعی و جمع شتات عمری دولة
السلطان..... ابوالمظفر شهاب الدين محمد شاه جهان
بادشاه..... وهدات بعين عنایتہ ملحوظا و بين اعين
الناس مغبوطاً. فعیت بی العلل وضافت علی الحیل،

فشرعت في جمع ما سمح به خاطري العليل و ذهني
الكليل..... جاداً في تحقيق معانيه، بائعاً عن رموز مبانيه،
مومياً في اثنائه الى اجوبة شكوك الناظرين..... فجاءت
بعون الله كنزاً لا يحصى فوائده، وبحرا لا يقضى فرائده.

تا آنکہ سلطان ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ..... کی
دولت نے مجھے کھینچ لیا اور میرے انتشار طبع کو، اطمینان خاطر سے
بدل دیا..... میں اس کی نظر عنایت میں سما گیا اور اعیان ملک میں
محمود اقران بن گیا۔ اب حیلہ جوئی میرے لیے ناممکن ہو گئی اور
بہانوں کے دائرے مجھ پر تنگ ہو گئے۔ پس میں نے نکات و فوائد
جمع کرنے سے شروع کیے جو میری بیمار طبیعت اور کمزور ذہن میں
آئے تھے..... لیکن ان کی ترتیب و تدوین میں، میں نے تحقیق معانی
کو پیش نگاہ رکھا اور ان کے بنیادی مسائل کو موضوع بحث ٹھہرایا۔ نیز
اس تحریر میں قارئین کے شبہات کے جواب کی طرف اشارہ کناں
رہا..... چنانچہ اللہ کی مدد سے ایسا خزانہ معرض ظہور میں آیا اور ذہن
نے اگلا جو بے شمار فوائد پر مشتمل ہے اور ایسا سمندر سامنے نمودار ہوا،
جس کے موتیوں کا ختم ہونا ناممکن ہے۔

اس طرح پہلے پارے کی تفسیر کا حاشیہ مکمل کر کے انہوں نے شاہ جہان کو پیش

کیا۔ لکھتے ہیں:

ثم لما فرغت من تسويد ما يتعلق بتفسير الجزء الاول...

جعلته عرضة لسدة السنية و تحفة لخدمة العلية.

پھر جب میں پہلے پارے کی تفسیر سے متعلق تحشیہ سے فارغ ہوا..... تو
اسے (شاہ جہان بادشاہ کے) آستانہ بلند کی لیے پیش کیا اور اس کی
خدمت عالیہ کے لیے اسے تحفہ بنایا۔

شاہ جہان کے ملاحظہ میں آنے کے بعد انہوں نے تفسیر کے دوسرے جز کا حاشیہ
لکھا اور عہد شاہ جہانی کی یہ عظیم خدمت معرض ظہور میں آئی۔ اس تحشیہ نے اتنی مقبولیت
حاصل کی کہ اسے مصر اور روم کے علما نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ یہ حاشیہ ہندوستان
میں بھی چھپ چکا ہے اور مصر میں بھی۔

مولانا سیالکوٹی کے اس حاشیے کی خصوصیات یہ ہیں:

- ☆ تفسیر بیضاوی کے مشکل الفاظ کی لغوی و نحوی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔
- ☆ ایسے جملے جو مغلق اور وضاحت طلب ہیں، ان کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی پوری
طرح صراحت فرمائی گئی ہے۔
- ☆ ان احادیث کی، جو تفسیر بیضاوی میں درج ہیں، سند بیان کر دی ہے اور جن کا
مختصر الفاظ میں ذکر ہے، ان کا پورا متن درج کر دیا ہے۔

(۲) حاشیہ کشاف:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے زنجیری کی تفسیر کشاف کا حاشیہ بھی لکھا ہے، جو غیر
مطبوعہ ہے اور جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی رام پور لائبریری میں موجود ہے۔

(۳) حاشیہ مقدمات تلوح تو ضیح:

تلوح تو ضیح، اصول فقہ کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا متن ”تنقیح الاصول“
ہے۔ جو صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی (متوفی ۷۴۷ھ) کی تصنیف ہے۔ بعد کو

تنقیح الاصول کی شرح صدر الشریعہ نے خود ہی لکھی، جس کو "التوضیح فی حل غوامض التنقیح" کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن یہ شرح بجائے خود شرح طلب اور مزید وضاحت کی متقاضی تھی، اس لیے علماء نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ اس کی سب سے اہم اور پہلی شرح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی (متوفی ۷۹۲ھ) نے ۷۵۸ھ میں "التلویح فی کشف حقائق التنقیح" کے نام سے لکھی۔ سب سے زیادہ مقبولیت اسی حاشیہ "تلویح" کو حاصل ہوئی۔ اور پھر بہت جلد اس حاشیہ نے اصول فقہ کی مستند درسی کتاب کی حیثیت اختیار کر لی اور اسے مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں شامل کیا گیا، جسے اب بھی برصغیر کے مدارس میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے۔

واقعات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں "اصول بزدوی" مروج تھی۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) کے عہد میں "حسامی" کا ذکر بھی آتا ہے، جس پر عہد تغلق کے ہندی عالم مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے حاشیہ تحریری کیا تھا۔ بعد ازاں "المنار" بھی مدارس میں آگئی۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی کے حوض خاص پر مدرسہ تعمیر کیا تو اس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی (متوفی ۷۹۰ھ) کو مدرس مقرر کیا جو دراصل ملتان کے باشندے تھے اور دہلی چلے گئے تھے۔ انہوں نے "توجیہ الافکار" کے نام سے "المنار" کی شرح سپرد قلم کی، جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سید یوسف بن سید جمال حسینی..... برمنار نیز شرح دارد مسکئی بتوجیہ الافکار۔

تلویح توضیح کی ترویج مدارس ہند میں غالباً نویں صدی ہجری میں ہوئی، جب اس ملک کے علماء علامہ سعد الدین تفتازانی سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آئے۔ ہندوستان کے علماء میں سب سے پہلے تلویح کا حاشیہ شیخ وجیہ الدین گجراتی نے کیا۔ اس کے دوسرے محشی

شیخ یعقوب بن حسن صرفی کشمیری تھے جو نہ صرف کشمیر کے علما و فضلا میں بلکہ پورے ہند میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے علاوہ شیخ نورالدین محمد صالح گجراتی، شیخ محمد عاشق چریاکوٹی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند شیخ عبداللہ لیب نے تلوح توضح کے حواشی قلم بند کیے۔ متاخرین میں مولانا جمال بن رکن الدین گجراتی، شیخ امان اللہ بناری اور قاضی عبدالحق بن محمد اعظم کابلی کے نام اس کے حاشیہ نویسوں میں لائق تذکرہ ہیں۔

تلوح توضح کا معرکہ آرا حصہ ”مقدمات اربعہ“ کا ہے، جو ”حسن و قبح افعال“ کے مسئلے کی وضاحت سے متعلق ہے۔ یہ بحث اگرچہ مسئلہ جبر و اختیار کے بارے میں علم کلام سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اصول فقہ میں بھی اس سے تعرض کیا گیا ہے۔

ہندی علما نے پوری تلوح توضح پر حواشی لکھے اور بڑی عمدگی سے اس خدمت علمی سے عہدہ برآ ہوئے۔ مگر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس معاملے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے صرف تلوح توضح کے مقدمات اربعہ کی تشریح کی اور اس اہم بحث کو اپنی کاوش فکر کا موضوع ٹھہرایا۔

(۴) حاشیہ شرح عقائد نسفی:

عقائد و کلام ایک اہم موضوع ہے، اس پر بہت سی کتابیں ضبط تحریر میں لائی گئیں، جن میں ایک کتاب ”عقائد نسفی“ ہے۔ احناف میں اس کو بڑی قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے مصنف علامہ نجم الدین عمر بن محمد النسفی (متوفی ۵۳۷ھ) ہیں۔ متعدد علما نے اس کی شروح لکھیں، جن میں ایک شرح، جو ”شرح عقائد نسفی“ کے نام سے متداول ہے، علامہ سعد الدین تفتازانی نے لکھی اور بہت جلد مدارس عربیہ میں شامل ہو گئی ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کی اہمیت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ علما نے شرح عقائد نسفی کے حواشی تحریر کیے اور اس میں جو امور وضاحت طلب ہیں، ان کو حل کیا۔

فاما طواعنه الغواشی کتبوا علیه الحواشی۔

علمائے اس کی تہہ میں چھپے ہوئے مطالب کو ظاہر یا اور اس پر حاشیے لکھے۔

برصغیر پاک و ہند میں شرح عقائد نسفی کو ذکر سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے واقعات کے ضمن میں عہد ہمایوں کے مشہور عالم مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ) کے حالات میں ملتا ہے۔ وہ اس طرح کی عہد ہمایوں میں جو علماء مغل فاتحین کے ساتھ وارد ہند ہوئے، ان میں ایک ملا علاء الدین لاری تھے، جن کو اپنے علم و فضل پر اس درجہ ناز تھا کہ کسی ہندی عالم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انہوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ قلم بند کیا اور بڑے فخر کے ساتھ مولانا حاتم سنبھلی کو بغرض تبصرہ پیش کیا۔ مولانا حاتم سنبھلی نے یہ حاشیہ دیکھا تو اس پر ایسے دقیق اور وزنی اعتراض کیے کہ ملا علاء الدین لاری سے ان کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ واقعہ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

چوں ملا علاء الدین لاری بدعویٰ تمام حاشیہ را کہ بر شرح عقائد نسفی نوشتہ، نزد میاں بردہ۔ بعد از مطالعہ چنداں متدقیق کردہ اند کہ ملا علاء الدین راجح جواب نماند۔

یعنی ملا علاء الدین لاری بدعویٰ علم کے ساتھ وہ حاشیہ جو انہوں نے شرح عقائد نسفی پر لکھا تھا، میاں حاتم سنبھلی کے پاس لے گئے۔ انہوں نے مطالعہ کے بعد اس پر اس قدر دقیق علمی اعتراض وارد کیے کہ ملا علاء الدین ان کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

اس طرح شرح عقائد نسفی مدارس ہند میں آئی۔ پھر اس پر کئی علمائے ہند نے حواشی لکھے، جن میں مولانا علاء الدین لاری، شیخ نظام الدین بدخشی اور مولانا وجیہ الدین گجراتی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔

اس پر ایک حاشیہ، علمائے روم میں کے ایک عالم مولیٰ احمد بن موسیٰ الخیالی نے بھی لکھا تھا، جو اپنی محشی کے نام کی مناسبت سے حاشیہ خیالی کے نام سے معروف ہے۔ شرح

عقائد نسفی کا یہ بہت عمدہ حاشیہ ہے، اور عربی مدارس کے علما و طلباء میں متداول و مشہور۔ دیگر ممالک کے علما کی طرح خطہ ہند کے علما نے بھی اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا۔ چونکہ یہ داخل نصاب ہو گیا تھا، اس لیے متعدد ہندی علما نے اس پر حواشی لکھے، جن میں گیارہویں صدی ہجری کے اصحاب علم میں سے مولانا عبدالسلام دیوبی، شیخ محمد سعید سرہندی اور مفتی وجیہ الدین گوپا مسوی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کو اپنی کاوش فکر کے لیے منتخب فرمایا۔ اس پر علمائے روم نے بھی حواشی لکھے ہیں اور علمائے ہند نے بھی، لیکن طلبائے علم ان حواشی سے مطمئن نہ تھے۔ اس ضمن میں خود ان ہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

لکن ما اتوا بما یروی الغلیل اویشفی العلیل، لما ان
ابکارہ آبیہ عن خطبة کل عاذب و مخدواتہ محتجبة
لاتجلی لکل طالب.

لیکن ان حاشیہ نویس علما نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو لوگوں کی علمی تشنگی دور کر سکتی، یا بیماروں کو حقیقی شفا بخشنے کے قابل ہوتی، کیوں کہ کتاب کے گہرے مسائل کے نقاب میں چھپی ہوئی دوشیزہ ہر شخص کو پیغام شادی دینے سے انکار کرتی ہے اور اس کے پردوں میں مستور غوامض ہر طلب گار کے سامنے اپنا نقاب نہیں اٹھاتے۔

ان حواشی میں جو کمی رہ گئی تھی، مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ نے اس کو کما حقہ پورا کر دیا اور قاری کی سطح ذہن پر جو شبہات ابھر سکتے تھے، انہیں بطریق احسن رفع فرما دیا۔ لکھتے ہیں:

فصرفت برهة من عنفوان الشباب فی حل مبانیہ و
انتہت فرصة عن اعین الزمان لتحقیق معانیہ..... فحققت
مقاصدہ و بینت مصادره و مواردہ..... مجیباً عن شبهة

الناظرین فجاء بحمد الله تعالى موافقاً للمامول و تم بعون
الله تعالى مطابقاً للمسئول۔

سو میں نے اپنے عقنوان شباب کا ایک حصہ اس کے بنیادی مسائل کو
حل کرنے میں صرف کر دیا اور اس کے تحقیق معانی کی غرض سے
زمانے کی آنکھوں سے فرصت کے کچھ لمحات اڑا لیے..... اس کے
مقاصد و مطالب کی گہرائی تک پہنچا اور اس کے مصادر و موارد بیان
کیے..... کتاب پڑھنے والوں کے شبہات کا جواب دیا۔ اس طرح یہ
کتاب توقع کی عین مطابق ہو گئی۔ الحمد للہ تعالیٰ، اللہ کی مدد سے
دوستوں کی تمنا کے ہم آہنگ ہو گئی۔

حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ بر حاشیہ خیالی کا
ذکر کیا ہے اور اس کو بہترین حاشیہ قرار دیا ہے:

وعلى الخيالى حاشية..... للملا عبد الحكيم بن شمس الدين
الهندي السیالکوٹی متوفى سنه سبع و ستين و الف و هى احسن الحواشى
مقبولة عند العلماء.

اور خیالی پر..... ملا عبد الحکیم بن شمس الدین ہندی سیالکوٹی نے حاشیہ تحریر کیا، جو
۱۰۶۷ھ میں فوت ہوئے۔ خیالی کا یہ بہترین حاشیہ ہے اور علما میں مقبول و مشہور ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ حاشیہ انہوں نے بادشاہ ہند شاہ جہان کے نام معنون کیا۔

(۵) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوآنی:

قاضی عضد الدین الایبھی (متوفی ۷۵۶ھ) کی عقائد میں ایک کتاب عقائد
عضدی کے نام سے معروف ہے، جس کی بہت سے علما نے شرحیں لکھیں۔ ان میں ایک شرح

محقق دوانی یعنی علامہ جلالا الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ) نے بھی لکھی جو ”شرح عقائد جلالی“ کے نام سے ہمارے مدارس میں متداول رہی ہے اور علما و طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بعد میں شرح عقائد جلالی پر علما نے حواشی تحریر کیے، جن میں خود محقق دوانی کے بعض جلیل القدر تلامذہ بھی شامل ہیں۔

شرح عقائد جلالی جب برصغیر میں پہنچی اور علمائے ہند میں مروج ہوئی تو اس پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حاشیہ لکھا اور مولانا ہی اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں، جنہوں نے اس اہم کتاب کو حاشیہ کے لیے منتخب کیا۔ بعد ازاں دیگر علمائے ہند نے اس پر حواشی تحریر کیے۔

(۶) حاشیہ شرح المواقف:

قاضی عضد الدین الأبیجی (متوفی ۷۵۶ھ) کے متون میں علم الکلام سے متعلق ”الموقف فی الکلام“ کو ایک متن متین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس دور کے وہ سلاطین و ملوک جن کو اس کی عظمت کا علم تھا، متمنی تھے کہ اس کے فاضل مصنف، علم کلام کے اس عظیم شاہ کار کا انتساب اس کے نام کریں۔ ان سلاطین میں ہندوستان کا بادشاہ سلطان محمد تغلق بھی شامل ہے۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ) نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان لانے اور ان کی کتاب ”المواقف“ کو اپنے نام معنون و منسوب کرانے کے لیے دہلی کے نامور فاضل مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا۔

المواقف پر متعدد اہل علم نے حواشی و شروح لکھے جن میں ایک شرح میر سید شریف جرجانی کی ہے، جو محمد بن مبارک شاہ منطقی کے شاگرد تھے اور محمد بن مبارک نے براہ راست مصنف ”المواقف“ قاضی عضد الدین سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ گویا میر سید شریف جرجانی کو صرف ایک واسطے سے قاضی موصوف کا شرف تلمذ حاصل تھا۔ یہ نہایت عمدہ شرح

ہے اور مدارس عربیہ میں عرصے تک متداول رہی ہے۔

سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) کی شرح المواقف پر ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لکھا اور واقعہ یہ ہے کہ فضلاء ہند میں سے اسی حاشیہ کو سب سے زیادہ قبولیت اور آشراف حاصل ہوا۔ ہندوستان کے باہر کے اہل علم میں بھی اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ حاجی خلیفہ نے ہندی علما کے حواشی میں سے صرف مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ کا ذکر کیا ہے۔

وعلى شرح المواقف للسيد حاشية لعبد الحكيم
السيالكوٹی اللاهوري.

اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی
لاہوری نے حاشیہ لکھا۔

بیرون ہند میں اس حاشیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ
استنبول اور مصر میں شرح مواقف کے تین حاشیے طبع ہوئے ہیں، جن میں ایک حاشیہ مولانا
عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہے۔

لیکن مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ شرح المواقف مکمل نہیں ہے، صرف موقف خامس
(پانچویں موقف) تک ہے۔ مولانا ممدوح، مقدمہ حاشیہ میں خود وضاحت کرتے ہیں کہ یہ
حاشیہ انہوں نے اپنے بیٹے مولانا عبداللہ لیب کے لیے، جبکہ وہ یہ کتاب ان سے پڑھتے
تھے، لکھا تھا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

هذه فوائد بل فرائد علقته على شرح المواقف سيد
المعقنين و افضل المدققين عند قراءة قرّة العين لهذا
الغريب عبد الله الملقب بالليب، تذكرة للاحباب و

تحفة لاصحاب، وعدة ليوم الحساب، وانا الفقير
التمسك بالجبل المتين عبدالحكيم بن الشيخ
شمس الدين.

یہ فوائد و نکات جنہیں موتیوں سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ (حواشی) ہیں
جو میں نے سید المحققین اور افضل المدققین (میر سید شریف جرجانی)
کی شرح المواقف پر اس زمانے میں تحریر کیے تھے، جب مجھ غریب
کی آنکھوں کی ٹھنڈک (میرا بیٹا) عبد اللہ، جس کا لقب لیب ہے،
مجھ سے یہ کتاب پڑھتا تھا۔ میں نے ان حواشی کو اپنے احباب کے
لیے ایک یادگار،..... رفقا کے لیے ایک تحفہ اور روز قیامت کے لیے
توشہ بنایا ہے۔ اور میں فقیر دین کی مضبوط رسی کو پکڑنے والا عبدالحکیم
بن شیخ شمس الدین ہوں۔!

(۷) حاشیہ شرح شمسیہ:

شمسیہ، علم منطق سے متعلق درجہ اعلیٰ کے درسی نصاب کا متن متین ہے، جس کا
پورا نام ”الرسالة الشمسية في قواعد المنطقية“ ہے۔ اس کے مصنف نجم الدین کا تہی ہیں، جو
محقق طوسی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنی یہ تصنیف خواجہ شمس الدین وزیر کے نام معنون
کی تھی، اسی وجہ سے یہ ”شمسیہ“ کے نام معروف ہوئی۔ اہل علم میں اس متن نے بڑی قبولیت
حاصل کی اور علما نے اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔ ان شرحوں میں سب سے زیادہ مقبولیت
قطب الدین رازی کی شرح کو ہوئی۔ ان کی شرح کا اصل نام ”تحریر المنطقية في شرح
الرسالة الشمسية“ ہے مگر یہ شرح اپنے مصنف کے نام کی مناسبت سے ”قطبی“ کے نام سے
معروف ہوئی۔

قطبی، اپنی تصنیف کے جلد ہی بعد داخل نصاب ہو گئی اور متعدد علمائے منطق نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ لیکن حلقہ علماء و طلباء میں درجہ قبولیت صرف دو حاشیوں کو حاصل ہوا۔ ایک میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو جو اپنی مصنف کے نام کی وجہ سے ”سعدیہ“ کہلاتا ہے۔

چونکہ مدارس ہند میں شرح شمسہ کو منطق کی اعلیٰ درجے کی نصابی کتاب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے علمائے ہند نے اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا اور اس حواشی تحریر کیے، جن میں مولانا عبدالوہاب کشمیری، مولانا وجیہ الدین گجراتی، شیخ ہبہ اللہ شیرازی اور قاضی نور اللہ شوستری کے حواشی کے قبال ذکر ہیں۔

لیکن ”قطبی“ اور ”میر قطبی“ پر ان علمائے گرامی قدر کے حواشی کے علاوہ ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی لکھا، اور یہ حاشیہ اس زمانے میں لکھا جب ان کے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب ان سے یہ کتابیں پڑھتے تھے۔ اس حاشیے نے فنی اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی اور فاضل محشی نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس کا انتساب بھی شاہ جہان بادشاہ کے نام کیا۔

اس حاشیے کو علمی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملا محبت اللہ بہاری نے ”سلم العلوم“ میں قطبی کے کسی ہندی حاشیہ نویس کا حوالہ نہیں دیا۔ صرف اسی حاشیہ کو لائق التفات گردانا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ سلم العلوم کے شارحین میں سے ملا حمد اللہ نے بالخصوص اپنی شرح میں متعدد مقامات پر ”فاضل لاہوری“ کا نام لکھ کر اس کی صراحت کی ہے اور ان کے افادات عالیہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ حاشیہ سپرد قلم کرنے کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ قطبی اور میر قطبی کے بعض حواشی اپنی شہرت کے باوجود بعض مقامات پر تشنہ تحقیق ہیں اور بعض اپنے

اندر بلا مقصد طوالت لیے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان فضلا وعلما کے حواشی ان کے نزدیک طلبا کے لیے زیادہ مفید مطلب اور لائق استفادہ نہ تھے۔ لہذا انہیں یہ حواشی تحریر کرنا پڑے۔

(۸) حاشیہ شرح مطالع الانوار:

مطالع الانوار، قاضی سراج الدین محمد بن ابوبکر رموی (متوفی ۶۸۹ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ”حصے“ کو مصنف شہیر ”طرف“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ طرف اول، منطق کے موضوع سے متعلق ہے، اور طرف ثانی فلسفہ و حکمت کے مسائل کو محیط ہے۔ اس کے چار اجزا ہیں:۔ جواہر، اعراض، امور عامہ اور العلم الالہی!۔ شرح مطالع، برصغیر کے حلقہ درس میں متداول ہوئی تو متعدد علمائے ہند نے اس پر حواشی لکھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نورالحق دہلوی نے بھی حاشیہ لکھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس پر حاشیہ تحریر کیا، جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی بانگی پور لائبریری میں موجود ہے۔

(۹) حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمتہ

ہدایۃ الحکمتہ، اشیرالدین ابہری کی تصنیف ہے، یہ اگرچہ ایک صغیرا لکھنؤ رسالہ ہے، لیکن اپنے موضوع میں بڑا اہم ہے اور بہت سے علما نے اس کو شروع و حواشی کا مستحق گردانا ہے۔ اس کی ایک شرح، علامہ جلال الدین دوانی کے تلمیذ رشید میر حسین میبذی نے لکھی، جو اس کے شارح کے نام پر ”میبذی“ کہلائی۔ پھر علما میں یہی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمتہ) مروج ہو گئی۔

(۱۰) الرسالة الخاقانیۃ

عبدالحکیم سیالکوٹی کی اہم ترین تصنیف الرسالة الخاقانیۃ ہے، جسے الدرۃ

الشمینة فی علم الواجب تعالیٰ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، مولانا عبدالحی الحسنی نے اس کا ذکر اپنی تصنیف الثقافة الاسلامیة فی الہند (ص ۲۳۸) میں علم کلام سے متعلق ان کتابوں کے سلسلے میں کیا ہے جو مستقل تصانیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس تصنیف کا سبب یہ ہوا کہ ایران کے شاہ صفی کی وفات پر جب اس کا بیٹا شاہ عباس دوم تخت نشین ہوا تو شاہجہان نے مرحوم شاہ کی تعزیت اور شاہ عباس کی تخت نشینی پر ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے ایک سفارت ایران بھیجی۔ برصغیر پاکستان و ہند اس زمانے میں علوم عقلیہ کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ ایران کے وزیر اعظم (خلیفہ سلطان) اعتماد الدولہ نے شاہجہانی سفارت کے ارکان سے ایک علمی محفل میں سوال کیا کہ امام غزالی نے قدم عالم، علم باری تعالیٰ اور نفی حشر اجساد کے سلسلے میں فلاسفہ کی تکفیر کی ہے، لیکن بعض علما نے ان مسائل کے بارے میں تاویل سے کام لیا ہے، برصغیر پاکستان و ہند کے علما کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟.....

ارکان سفارت محمد فاروق (مشرف) اور محبت علی (وقائع نویس) ان فاضلانہ سوالات کا جواب نہ دے سکے۔ جب شاہجہان کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو اس کے وزیر اعظم ملا سعد اللہ خان نے فی الفور ملا عبدالحکیم کو مسائل ثلاثہ مذکورہ کے سلسلے میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ لکھ کر دربار دہلی کو روانہ کرنے کی فرمائش کی تاکہ اسے ایران بھیجا جاسکے۔ (ملا سعد اللہ خان کے اس خط کے لیے دیکھیے۔ فہرست مخطوطات نادرہ، آصفیہ کتب خانہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۷ھ، ۲: ۳۱۹)۔ اگرچہ ملا عبدالحکیم نے الرسالة الخاقانیہ کے آخری چند صفحات میں حدوث و قدم عالم اور حشر و نشر جسمانی کے بارے میں فاضلانہ بحث کی ہے، لیکن بحث کا رخ زیادہ تر مسئلہ علم باری تعالیٰ کی طرف رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو الخاقانیہ فی مبحث العلم، رسالہ عبدالحکیم السیالکوٹی فی علم الواجب تعالیٰ، وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

علم باری تعالیٰ (اور دیگر صفات حسنہ) کا مسئلہ یونانی فکر سے متاثر مسلمان فلاسفہ اور علمائے اسلام کے درمیان قدیم سے زیر بحث چلا آیا ہے۔ اس بحث کو سب سے پہلے امام غزالی نے وضاحت کے ساتھ موضوع سخن بنایا۔ ان کے بعد مختلف علماء اسے آگے بڑھاتے رہے حتیٰ کہ ملا عبدالحکیم نے الرسالة الخاقانیہ تصنیف کیا۔ ان کے بعد آنے والے اہل فضل و کمال نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب کسی نہ کسی طرح ملا عبدالحکیم کے رسالے سے متاثر ہوئے۔ مثلاً منطق کے موضوع پر مشہور ہندوستانی تصنیف سلم العلوم (مصنفہ ملا محبت اللہ بہاری، ۱۱۱۹ھ) اور اس کی مشہور و معروف شروح میں الرسالة الخاقانیہ ہی کے مواد کو مخصوص انداز میں دھرایا گیا ہے۔ قاضی مبارک (م ۱۱۶۲ھ)، ملاحسن (م ۱۱۹۹ھ) اور قریبی زمانے میں مولانا بحر العلوم (م ۱۲۳۵ھ) مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی (م ۱۲۸۵ھ) وغیرہ ہم نے بھی اس مسئلے پر بحث کی ہے، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ملا عبدالحکیم کا الرسالة الخاقانیہ ان سب حضرات کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا اور سبھی اس چشمہ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔



مشاہیر سیالکوٹ

سیالکوٹ نہایت قدیم شہر ہے۔ اور ہندو عہد حکومت میں ہندو راجگان قدیم کی راجدھانی رہا ہے۔ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے یقیناً نامور ہندو اس سرزمین نے پیدا کئے ہوں گے۔ کسی نے دولت و امارت میں شہرت حاصل کی ہوگی۔ کوئی علم سنسکرت کا کامل گذرا ہوگا۔ کسی نے سنسکرت و ہندی کے اشعار میں اپنے جوہر دکھائے ہوں گے کوئی تیر و تلوار کا دھنی میدان جنگ میں اپنی نبرد آزمائی سے ارجن بھیم کا نام زندہ کرتا ہوگا۔ موسیقی اور مصوری کے قدیم علوم ہندو تہذیب کا مایہ ناز رہے ہیں۔ اس میدان میں بھی بڑے بڑے کامل الفن گذرے ہوں گے۔ دان پن (خیرات) بھی ہندو قوم کی گھٹی میں داخل ہے۔ کئی نئی مرد پیدا ہوئے ہوں گے غرض جس شہر میں صد ہا سال تک بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب رہا ہو۔ جس شہر نے صدیوں تک دارالحکومت ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہو۔ کچھ تعجب نہیں اگر شاہانہ سر پرستیوں کے طفیل بڑے بڑے کامل۔ عالم اور نامور لوگ وہاں پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن سیالکوٹ کی قدیم تاریخ چونکہ کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس لئے ایسے یگانہ روزگار لوگ جن کے واقعات زندگی موجودہ نسلوں کے لئے یقیناً رہبری کا کام دیتے۔ صفحہ تاریخ سے بالکل ناپید ہیں۔ غرض ہندو عہد قدیم میں بھی اس خاک سے بڑے بڑے و دیادان اٹھے ہیں۔ چنانچہ البیروٹی جس نے محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے اپنے کتاب الہند میں جن شہروں کا ذکر کرتا ہے ان میں ایک سیالکوٹ بھی ہے۔ سیالکوٹ کو دیکھنے کی اسے سجدہ تمنا تھی۔ لیکن وہ علیم الفرستی یا اور وجوہات سے سیالکوٹ نہ آسکا۔

ہندو عہد حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کا دور آتا ہے۔ اور ۱۲۱۲ھ میں سلطان محمود غزنوی پنجاب کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ قرار دیتا اور یہاں اسلامی حکومت

کاسنگ بنیاد رکھتا ہے۔ خاندان غزنوی سے لیکر خاندان لودھی اور بابر کے ابتدائی زمانہ تک سیالکوٹ کا ذکر تاریخ ہند کے اوراق میں کہیں کہیں نظر سے گذرتا ہے مگر اس زمانہ کے کسی مشہور آدمی کا نام تاریخ نہیں بتاتی، البتہ شیر شاہ سوری کے زمانہ سے بعض مشاہیر کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اور ان میں بھی صرف مسلمانوں کے نام ہم کو دکھائی دیتے ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ ان تاریخوں۔ تذکروں اور مذہبی کتابوں کے لکھنے والے عام طور پر مسلمان تھے۔

شیعہ بادشاہان کشمیر کے زمانہ میں اکثر علمائے سنت ترک وطن کر کے پنجاب آئے ہیں اور ان میں سے اکثر نے سیالکوٹ کو اپنا وطن و مسکن قرار دیا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں اکبر کی حکومت تھی۔ اسی وجہ سے مشاہیر سیالکوٹ میں چند ایک نام اہل خطہ بزرگان دین کے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال جس قدر مشاہیر کے نام سوری خاندان سے لیکر مغلیہ حکومت کے زوال و اختتام تک کے مل سکے ہیں مختصری کیفیت کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

میاں وارث کاشمیری

شیر شاہ سوری سے لیکر سکندر سوری کے زمانہ تک سیالکوٹ کے مالکدار اور تعلقدار رہے۔ اکبر کے ابتدائی عہد اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک یہ اعزاز برابر قائم رہا۔ مولوی کمال الدین کاشمیری استاد مولوی عبدالحکیم نے اسی میاں وارث کی مسجد میں امامت و درس گاہ شروع کی تھی۔

حضرت شاہ حمزہ غوث

جن کا مزار پرانوار نالہ ایک سے پار بابا کی پیر کے متصل ہے۔ عہد اکبری کے مشہور متوکل درویشوں میں تھے۔ اکبر نے سیالکوٹ آ کر آپ سے ملاقات کی۔ اور خدام

درگاہ کے لئے جاگیر مقرر کر دی۔ تاریخ وفات

محمد غوث حمزہ قطب عالم چودروصل خداگردید موصول

بتاریخ وصالش گفت قاصر محمد متقی سلطان مقبول

جہاں آپ کا روضہ ہے وہاں اب اتنی رونق و آبادی ہے کہ ”حمزہ غوث“ کے نام

سے ایک موضوع آباد ہے۔

بابا فتح اللہ حقانی

حضرت بابا اسمعیل کاشمیری کے فرزند ارجمند تھے۔ جو صاحب ریاضت

و کرامت تھے۔ اور جن کی بندگی و عظمت اس سے ظاہر ہے کہ قدوة العرفا حضرت مخدوم

محبوب العالم شیخ حمزہ صاحب کاشمیری نے بھی آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔ کشمیر میں چک

بادشاہ ہوں کا دور دورہ تھا جو مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے بل بوتے پر شیعہ لوگ ”اصحاب ثلاثہ“

پر علانیہ تبرا کرتے تھے اور اہل سنت دم نہ مار سکتے تھے۔ بابا فتح اللہ بھی یہ حال دیکھتے تھے اور

خاموش تھے۔ آپ نے اس خیال سے کہ اہل تشیع اصحاب ثلاثہ کو جو گالیاں دیتے ہیں وہ ان

کی بجائے میرے بیٹوں کے نام موسوم ہوں اپنے تینوں بیٹوں کے نام ابو بکر، عمر اور عثمان

رکھ دیئے۔ جب تبرا کے علاوہ اہل سنت مسلمانوں پر جبر و ستم بھی ہونے لگا۔ اور ان کی عزت

و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ تو آپ معہ اہل و عیال کشمیر جیسے جنت نظیر وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر

باد کہہ کر سیالکوٹ چلے آئے۔ جب سیالکوٹ والوں کو آپ کے علم و تقویٰ کا حال معلوم ہوا تو

تمام ارباب فضل و کمال ان کی طرف جھک پڑے مولانا کمال اور مولانا جمال آپ کے داماد

اور مرید و شاگرد تھے۔ تاریخ خواجہ انتظمی میں لکھا ہے کہ حضرت بابا فتح اللہ شاہ نے وفات بھی

سیالکوٹ ہی میں پائی ہے۔

بابا عمر حقانی کاشمیری

شیخ العصر بابا فتح اللہ شاہ حقانی کے بیٹے تھے۔ آپ ہی کے پاس مشائخ کشمیر کی جماعت خواجہ اسحاق۔ بابا داؤد خاکی۔ شیخ یعقوب صرنی۔ ملا کمال وغیرہ ۲۸ علماء و مشائخ اور رؤسائے کشمیر بانہال کے رستے سیالکوٹ آئے تھے۔ بابا عمر پر اکبر کی بجد عنایتیں تھیں۔ آپ ہی کی وساطت سے علماء و صلحائے کشمیر کی جماعت اکبر کے دربار میں پہنچی۔ اور اسی جماعت کی استدعا پر اکبر نے کشمیر کو خانہ جنگیوں سے نجات دلا کر ممالک محروسہ میں شامل کیا۔ تسخیر کشمیر ۱۵۵۶ء، ۹۹۴ھ کے بعد اکبر نے حضرت بابا عمر کو ۱۹۰۰ بیگھ زمین (روضۃ الابرار) فارسی (صفحہ نمبر ۵۱) موضع رسول پور پر گنہ بنت حوالے دہلی میں بطور جاگیر عنایت کی۔ دو موضع سیالکوٹ سے دیئے سرکار پنجاب کے ماتحت تھا۔ اور چند قریہ خادمان بابا عمر کے لئے کشمیر میں وقف کئے۔ بابا عمر وفات کے بعد اپنے نامور باپ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آخوند مولانا جمال

علوم دینیہ میں ماہر کامل تھے۔ اصل وطن کشمیر تھا۔ ارادت معنویہ کے لیے بابا فتح اللہ کاشمیری کے پاس سیالکوٹ آئے۔ مولانا کمال جو مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی کے استاد تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا جمال کے خوان علم سے صد ہا لوگ سیر ہوئے۔ گوشت بہت کم کھاتے تھے۔ ہمیشہ بوریائے فرش پر سوتے رہے۔ حضرت بابا فتح اللہ نے اپنی ایک بیٹی کا آپ سے نکاح کر دیا تھا۔ آخر عمر میں آپ کشمیر واپس آ گئے۔ حضرت بابا نصیب اور شیخ اسماعیل چشتی اور دیگر اکابر و مشائخ وقت آپ کی بابرکت صحبتوں سے مسفیض ہوتے رہے۔ قاضی ابوالقاسم عرف ملا جمالی جو کشمیر کی قضاء پر مامور تھے آپ کے نامور فرزند تھے۔

آخوند ملا کمال

مولانا جمال کے چھوٹے بھائی اور مولوی عبدالحکیم۔ حضرت مجدد الف ثانی۔ اور نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان جیسے نامور شاگردوں کے استاد تھے شیخ کامل۔ حلال فائق۔ کشاف حقائق۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ مجموعہ علم و عمل وزہد و تقویٰ تھے۔ مگر نسبت علمی بہت غالب تھے۔ سیالکوٹ اور لاہور میں مدت تک مسند تدریس و تلقین پر متمکن رہ کر دور و نزدیک کے لوگوں کو علوم ظاہری و باطنی سے مستفیض کرتے رہے۔ اکبر اور جہانگیر کے دربار میں آپ کی بڑی وقعت تھی۔ ۱۰۱۷ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ آپ حضرت شیخ یعقوب ضوفی اور بابا داؤد خاکی وغیرہ مشائخ کشمیر کے ساتھ شیخہ بادشاہان کشمیر کے ظلم سے تنگ آ کر پنجاب میں آئے تھے۔

مولانا محمد رضا

(روضۃ الابرار میں آپ کا نام محمد صادق عرف حکیم دانا لکھا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۲ھ کی تصنیف ہے۔ اسرار الابرار میں جو بابا داؤد مشکواتی کی تصنیف ہے اور ۱۰۶۳ھ میں لکھی گئی ہے آپ کا نام محمد رضا عرف حکیم دانا اور مولانا کمال کا نام بوزضا محمد کمال درج ہے۔ کشمیر کی دیگر تاریخوں میں بھی محمد رضا نام ہی درج ہے۔ اور وہی صحیح ہے۔)

معروف بہ حکیم دانا۔ ابن مولانا کمال کشمیری۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ برسوں تک سیالکوٹ میں علمی مشاغل کی رونق رکھی۔ جہانگیر نے آپ کی شہرت و قابلیت سن کر آپ کو اپنی مجلس میں باریاب کیا۔ آخر عمر میں وطن کی محبت غالب آئی۔ اور سب کچھ ترک کر کے کشمیر چلے آئے۔ کشمیر میں جب اہل تسنن و تشیع کا ایک زبردست مباحثہ و معارضہ جہانگیر کے عہد میں ہوا۔ تو اہل تسنن کی طرف سے آپ ہی مناظر تھے یہاں تک کہ ملا حبیب اللہ شیخہ کو آپ نے ساکت کر دیا۔ سری نگر کے محلہ جملہ میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔

حاجی فتح محمد

سیالکوٹ کا محلہ حاجی پورہ انہی کے نام پر آباد ہے۔ یہ بزرگ جہانگیر کے زمانہ میں وظیفہ خوار شاہی تھے۔ ہندو مسلمان بلا تمیز مذہب و ملت ان کے سخاوت سے مستفیض ہوتے تھے۔ محلہ حاجی پورہ کی عالیشان مسجد انہی کی تعمیر کردہ ہے۔ روضۃ (روضۃ الابرار مصنفہ مولوی محمد الدین فوٹی مرحوم۔ مولوی فاضل۔ ایم او ایل لاہور۔ مطبوعہ ۱۳۰۲ھ)۔ الابرار میں اخوند ملانا زک کاشمیری کے ذکر میں لکھا ہے کہ اخوند مذکور حاجی فتح محمد سیالکوٹی کے مرید تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے آپ صاحب ارشاد بھی تھے۔ آپ کو روضۃ الابرار میں صاحب کمالات و کرامات لکھا ہے۔

حاجی لال بیگ

عہد جہانگیری کے وظیفہ خوار اور معافی دار تھے۔ دسترخوان بہت وسیع تھا۔ موضع غازی پور جہاں آپ کا مزار ہے آپ ہی کا آباد کردہ ہے۔ جو سیالکوٹ سے بجانب گوشہ شمال مشرق بفاصلہ ایک میل واقع ہے۔

حاجی عبدالغنی

بعض آپ کو حاجی عبدالغنی بھی کہتے ہیں۔ جہانگیری عہد کے پرہیزگار اور خدا پرست تھے۔ بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا۔ سب غریبوں اور مسکینوں کی تواضع میں صرف کر دیتے تھے مزار حضرت شاہ حمزہ غوث سے ذرا آگے آپ کا مزار ہے۔

حاجی مقصود

یہ بزرگوار بھی شاہی وظیفہ خوار تھے۔ نہایت نیکوکار اور دین پرور مزار آپ کا غلہ (کنک) منڈی کے متصل واقع ہے۔ ۱۳۰۲ھ کے قریب مستری فضل دین نے بہ لاگت کثیر آپ کا مزار مرمت کرا دیا تھا۔

شیخ رنگا وڈہرہ

سیالکوٹ کا ایک بہت بڑا امیر آدمی تھا۔ اس نے ایک عالیشان باغ اور تالاب بنوایا۔ اور دونوں جگہ خوبصورت بارہ دریاں تعمیر کرائیں۔ جو بارہ دریا تالاب کے وسط میں تھی وہاں موسم گرما میں بذریعہ کشتی سیر و آرام کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ باغ کی کل زمین پچیس گھنٹوں تھی۔ اس باغ کا نام معہ اس کی عالیشان عمارتوں کے رنگ محل تھا۔ اسی رنگ محل کو اب رنگپورہ کہتے ہیں۔

شاہ سیدا

سیالکوٹ میں بزمانہ جہانگیر بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت شاہ دولہ گجراتی جن کی عمر کا بہت بڑا حصہ سیالکوٹ میں گذرا ہے۔ انہی کے مرید تھے۔ مزاران کا بازار کنک منڈی کے متصل واقع ہے۔

حضرت شاہ دولہ گجراتی

جہانگیر کے آخر عہد حکومت میں گمان وڈہرہ سیالکوٹ کے ہاں نوکرتھے۔ شاہ جہان کے زمانہ میں حضرت شاہ سیدا صاحب کی فیض صحبت سے پہلے ملازمت ترک کر دی۔ پھر علاقہ دنیوی سے منہ موڑ لیا۔ سیالکوٹ کی نواح میں اپنے بہت سے پل تعمیر کرائے ہیں۔ سیالکوٹ کی مشہور و مصفا ایک ندی کاپل جو نہایت مضبوط اور چونہ گچ بنا ہوا ہے۔ آپ ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ مزار آپ کا گجرات میں مرجع خلائق ہے۔ روضہ قیومیہ میں لکھا ہے صاحب جذبہ تھے۔ باطنی فیض آپ سے کسی کو نہیں پہنچ سکا۔ تذکرہ اکابر اسلام (ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ جس میں علماء و مشائخ اسلام اور اساتذہ اسلام کا ذکر ہے۔ مصنفہ منشی دیبی پرشاد مصنف و مؤرخ راجپوتانہ۔ مطبوعہ پیسہ اخبار ۱۹۰۴ء۔) میں آپ کے متعلق لکھا ہے۔ بہت سے آدمی اس کے باورچی خانہ

سے کھانا کھاتے تھے۔ اس نے بہت سے وحشی جانور اور چرند پرند جمع کر رکھے تھے۔ ہاتھی۔ شیر۔ اونٹ۔ بکری بھینڑ وغیرہ۔ ان سب کو اس کے یہاں سے خوراک ملتی تھی۔

قاضی محمد عارف

جو مولانا غنی کاشمیری کا ہم عصر اور عہد شاہجہانی کے نامور شعراء میں تھا۔ تاریخوں میں سیالکوٹی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا جمال کے بیٹے قاضی ابوالقاسم کا فرزند تھا۔ ایک رباعی آپ کی یادگار ہے جو درج ذیل ہے:

خواہم کہ ازیں نشیب و پستی برہم وزننگ خودی و خود پرستی برہم
یک جرعه از جام نیستی نوش کنم از کشمکش خمار ہستی برہم

ملا عیسیٰ

سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ زہد و تقویٰ کے سرمایہ اور عالم ملکوتی کے سیاح تھے۔ حضرت میاں میر کی خدمت میں آ کر کامل اکمل ہو گئے۔ علوم باطنی کے علاوہ علوم ظاہری میں بھی صاحب کمال تھے۔ کبھی سیالکوٹ میں رہتے کہ وہ ان کا وطن تھا۔ اور کبھی لاہور میں کہ وہاں ان کے پیرو مرشد حضرت میاں جی (حضرت میاں میر) رہتے تھے۔ داراشکوہ لکھتا ہے۔ ملا عیسیٰ کی میرے ساتھ خط و کتابت بھی رہی ہے۔ ان کو تمام چرند و پرند کا ذکر و شغل سنائی دیتا تھا۔ ملا عیسیٰ ایسے ہی اعلیٰ پایہ کے بزرگ تھے۔ جن کے ساتھ خط و کتابت کرنے کا ذکر شہزادہ داراشکوہ نے خاص طور پر ایک قسم کے فخر کے ساتھ کیا ہے۔

ملا محمد سیالکوٹی

حضرت میاں میر کے مریدوں میں تھے۔ اور اپنے علم و فضل اور زہد و ورع کی وجہ سے حضرت کی نظروں میں پایہ بلند رکھتے تھے۔ سکینۃ الاولیاء میں شہزادہ داراشکوہ لکھتے

ہیں۔ سیالکوٹ ان کا وطن تھا۔ بیس سال تک خلوت و جلوت میں حضرت میاں میر کے رفیق رہے۔ ملا محمد صاحب کے حوالہ سے سکینۃ الاولیاء میں ایک روایت بھی نقل ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ ملا محمد اور میاں نتھالا ہوری اور دو ایک اور آدمی حجرے کے باہر دیوار کے سایہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر اور سلوک و معرفت کی باتوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں بادل گھر آیا۔ سرد ہوا خراٹے بھرنے لگی اور مینہ برسنے لگا۔ جس سے اس دلچسپی میں تفرقہ سا آ گیا۔ میاں نتھالے جس پر یہاں تک فضل الہی تھا کہ درخت تک بھی باوجود اس کے امی محض ہونے کے اس سے ہمکلام ہوتے تھے۔ عرض کیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو مینہ اور ہوا بھی دور ہو کر مطلع صاف ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں میر صاحب کو میاں نتھالے کے یہ جلالی کلمات ناگوار گذرے ناراض ہو کر فرمایا۔ اوتیلی کے بچے! اب تیری یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اپنی کراماتیں ظاہر کرتا اور خود فروشی کا متمنی ہے پھر بڑی نرمی اور مہربانی سے فرمایا۔ محمود کا فعل بھی محمود ہی ہوتا ہے۔ خبردار آئیندہ اس قسم کے کلمات زبان سے نہ نکالنا اور کارخانہ الہی میں دخل دینے کی جرأت نہ کرنا۔ شہزادہ نے سکینۃ الاولیاء ۱۰۵ھ میں لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ میاں محمد سیالکوٹی اب تک زندہ ہیں۔ میاں محمد کا انتقال اسی سنہ کے بعد کسی سال میں ہوا ہے۔

اخون میر محسن سیالکوٹی

روضہ قیوسیہ میں آپ کے متعلق چند الفاظ نظر سے گذرے ہیں۔ وہی لکھتا ہوں۔ ”آپ حضرت قیوم ثانی (امام محمد معصوم زمانی خلف حضرت مجدد صاحب قیوم اول) کے معتبر خلفاء سے ہیں۔ صاحب استقامت و کرامت تھے۔ علماء و صلحاء میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ سلوک باطنی آپ نے انتہائی درجہ تک حاصل کر کے خلافت پائی۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے (روحانی و علمی) فائدہ اٹھایا۔ اور خلافت کا درجہ حاصل کیا۔ آپ طریقہ علیہ احمدیہ پر نہایت شدت سے پابند تھے۔

حافظ نور محمد سیالکوٹی

آپ نے طویل عمر پائی ہے۔ درسی و رسمی علوم سے فارغ ہو کر سلوک و تصوف کی طرف خیال آیا۔ تو اپنے شہر کے نامور عالم و صوفی اخون میر محسن کے پاس پہنچے۔ وہاں دوا بھی تھی اور دعا بھی۔ یعنی علوم ظاہری و باطنی دونوں کا درس جاری تھا۔ حافظ صاحب اس مجلس سے کنڈن ہو کر نکلے۔ اور خلیفہ میر محسن کے مریدوں میں بھی داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنے مرشد کے پیر حضرت عروۃ الوقتی قیوم ثانی (حضرت عروۃ الوقتی امام معصوم قیوم ثانی فرزند سوم حضرت مجدد الف ثانی قیوم اول۔ ولادت حضرت قیوم ثانی ۱۰ اشوال ۱۰۰۰ھ۔ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۹۷ھ۔) کی خدمت میں سرہند میں پہنچے۔ وہاں نامی علماء و صلحاء جمع رہتے تھے۔ ان کی صحبتوں اور برکتوں اور حضرت قیوم ثانی کی توجہات سے ظاہری و باطنی علوم میں کمال فروغ حاصل کر لیا۔ پھر ۱۰۹۲ھ کے بعد بزمانہ عالمگیر جب حضرت حجۃ اللہ قیوم ثالث (حضرت حجۃ اللہ خواجہ محمد نقشبند ثانی قیوم ثالث۔ ولادت ۷ رمضان ۱۰۳۲ھ۔ وفات ۲۹ محرم ۱۱۱۲ھ۔) ہوئے تو ان کی خدمت میں بھی پہنچے۔ روضہ قیومیہ میں لکھا ہے کہ حافظ نور محمد صاحب حال و صاحب کرامات تھے۔ ان کے ارشادات و ہدایات نے بہت لوگوں کو انسان اور انسان سے مسلمان بنا دیا۔ حضرت قیوم ثالث کی وفات ۱۱۱۲ھ کے بعد آپ نے حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم چہارم (سلطان الاولیاء خواجہ محمد زبیر قیوم رابع۔ ولادت ۵ ذیقعد ۱۰۹۳ھ۔ وفات ۴ ذیقعد ۱۱۵۲ھ۔) کی طرف رجوع کیا۔ اس وقت آپ بوجہ کبر سنی و ضعف خود سفر کے ناقابل تھے۔ آپ نے اپنے چند مخلص و مرید آپ کی خدمت میں بھیجے۔ اور ایک عرضداشت بھیجی کہ یہ بے پروبال اس عالی خاندان کا تربیت یافتہ ہے۔ بہ سبب ضعف باطنی حاضر خدمت نہیں ہو سکا۔ دعا اور توجہ کیجئے کہ حق تعالیٰ اسے باطنی استقلال فرمائے جب حضرت قیوم چہارم کا جواب آپ کو ملا۔ تو آپ نے شکر گذاری کے بعد اپنے یاروں سے

فرمایا۔ حضرت نے اس کمزور بوڑھے کو از سر نو جوان کر دیا ہے۔ روضہ قیومیہ میں لکھا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے مشائخ عظام میں تھے۔ شیخ محمد سعید اور صوفی عبدالرحیم یہ دو نامور صوفی و عالم آپ کے پوتوں میں بہت مشہور گذرے ہیں۔ دونوں حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم رابع کے مریدوں میں تھے اور سرہند میں رہ کر ظاہری و باطنی علوم میں کامل ہوئے تھے۔

شیخ محمد سیالکوٹی

حافظ نور محمد کے مریدوں میں تھے۔ جب حافظ صاحب حضرت حجۃ اللہ قیوم ثالث کے مرید ہو گئے تو شیخ محمد بھی حضرت قیوم ثالث کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ اور سلوک باطنی و علوم ظاہری میں کمال حاصل کرنے کی بدولت نہ صرف حضرت حجۃ اللہ کے معتبر یاروں میں شمار ہونے لگے بلکہ آپ کو خلافت کا اعزاز بھی مل گیا۔

خلعت خلافت لے کر جب آپ سیالکوٹ واپس آئے تو آپ کی مجلس میں اہل طلب و علم اس کثرت سے آنے لگے۔ اور ارادتمندوں کی تعداد اس درجہ بڑھ گئی کہ آپ حافظ صاحب سے منحرف ہو کر ان کو اپنا مد مقابل سمجھنے لگے۔ حافظ نور محمد بھی صاحب کمال تھے۔ صد ہا لوگوں نے آپ سے باطنی فوائد حاصل کئے۔ بلکہ اکثروں کو خلافت بھی عطا کی۔ حافظ صاحب کو آپ کی بعض باتیں ناگوار گذریں۔ اس زمانہ میں حضرت قیوم ثالث حج کو گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی کی خبر سن کر شیخ محمد دکن جا کر ان سے ملے۔ اور اپنی اور حافظ صاحب کی بد مزگیوں کا ذکر کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تک حافظ صاحب کو راضی نہ کرو گے تمہارا باطن صاف نہ ہوگا۔ جب آپ واپس سیالکوٹ آئے تو آپ نے حافظ نور محمد صاحب سے معافی مانگی۔ مگر حقیقی رنجش مرتے دم تک قائم رہی۔

شیخ محمد اپنے زمانہ کے نامور عالم و صوفی تھے۔ فقہ۔ حدیث۔ تصوف و سلوک سب میں صاحب کمال تھے۔ عہد عالمگیری کے نامور علماء میں آپ کو شہرت حاصل تھی۔

مولوی شیخ اصغر علی

حافظ نور محمد کے مرید تھے۔ انہی کے ایما سے حضرت خواجہ محمد زبیر کی خدمت میں بمقام سرہند حاضر ہوئے چونکہ مولوی صاحب۔ علم۔ حلم اور ورع و تقویٰ سے موصوف تھے۔ حضرت نے آپ پر بڑی نوازشیں فرمائیں۔ اور جب ان میں ظاہری و باطنی خوبیاں دیکھ لیں تو خلعت خلافت سے مشرف فرمایا۔ ان کے عہد کے ایک بزرگ خواجہ ابوالفیض کمال الدین محمد احسان مصنف روضۃ القیومیہ جن کا سلسلہ نسبت پانچ واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے۔ مولوی صاحب کے متعلق یہ چشم دید واقعہ لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ سے ایسا فعل سرزد ہوا جو از روئے شرع مکروہ تھا۔ مولوی صاحب اپنی اس حرکت سے بہت گھبرائے اور ایسے نادم ہوئے کہ کانپنے لگے۔ آخر اپنا چہرہ سیاہ کر کے شہر میں ڈھنڈورہ پٹوایا اور تائب ہوئے۔ حضرت خواجہ محمد زبیر نے مولوی صاحب کے متعلق فرمایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص مردہ کو زمین پر چلتے پھرتے دیکھنا چاہے وہ حضرت ابو بکر صدیق کو دیکھ لے۔ سو میرے یاروں میں مولوی اصغر علی موجود زمانہ میں زندہ مثال ہیں۔ مولوی صاحب ظاہری و باطنی علوم کے جید عالم تھے۔ کثیر التعداد لوگوں نے دونوں علوم میں آپ سے کثیر المنفعت فوائد حاصل کئے ہیں۔

صاحب روضۃ القیومیہ کی تحریر کے مطابق آپ محمد شاہ بادشاہ کے عہد (۱۱۶ھ) تک زندہ تھے۔

صوفی شیخ احمد کاتب

حضرت خواجہ محمد زبیر کے مریدان خاص میں تھے۔ سلوک باطنی حاصل کر کے خلافت حاصل کی۔ شریعت کے کاموں میں سختی سے پابند تھے۔ فن کتابت میں ماہر ہونے کی وجہ سے کاتب کے نام سے مشہور تھے۔ کثرت علم کے ساتھ حسن عمل بھی رکھتے تھے۔

صوفی محمد اعظم

حافظ نور محمد صاحب کے معتبر یاروں میں تھے۔ بلکہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی۔ بعد میں حضرت خواجہ محمد زبیر کی خدمت میں بمقام سرہند حاضر ہو کر مورد عنایات رہے۔ آپ اپنے زمانہ کے نہایت نامور عالم تھے۔

مولوی عبدالکریم

آپ دو واسطہ سے مولوی عبدالکیم سیالکوٹی کے شاگرد ہیں۔ آپ حضرت خواجہ محمد زبیر کے معاصر میں تھے۔ حضرت کی وفات (۱۰۵۲ھ) کے بعد بھی آپ کی زندگی کا پتہ ملتا ہے۔ روضہ قیومیہ کی تصنیف کا شروع سال ۱۰۵۰ھ کے قریب ہے۔ چند سال کے التواء کے بعد یہ کتاب ۱۰۵۴ھ میں پھر شروع ہوتی ہے۔ کتاب اسقدر ضخیم ہے کہ یقیناً اس کی ترتیب و تکمیل میں چند سال صرف ہوئے ہوں گے۔ اور کتاب کے آخری صفحہ پر مولوی عبدالکریم کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب عہد محمد شاہی (۱۱۶۱ھ) تک زندہ تھے۔

شیخ محمد صدیق

نام ایک بزرگ بھی حضرت خواجہ محمد زبیر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کا نام روضہ قیومیہ میں حضرت خواجہ محمد زبیر کے مریدان خاص میں درج ہے۔

لالہ سیالکوٹی مل

عالمگیری یا محمد شاہی عہد میں اس نام کے ایک ہندو بزرگ سیالکوٹ میں گذرے ہیں۔ سنہ پیدائش وفات کا کوئی حال معلوم نہیں ہے۔ ان کی ایک تصنیف انشائے سیالکوٹی زمانہ قدیم میں دوسرے نامور انشا پردازوں کی طرز تحریر کی لاجواب ٹکرتھی۔ ان کا نام بھی ان کے سیالکوٹی ہونے کی دلیل ہے۔

شیخ محمد مراد

راقم الحروف ۱۹۱۷ء میں ڈھاکہ (بنگال) میں تھا۔ جہاں مشرقی بنگال کے نامور علم دوست حکیم حبیب الرحمن صاحب مشیر طبی نواب صاحب ڈھاکہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب دیکھی۔ جس کے مصنف کا نام محمد مراد سیالکوٹی تھا۔ یہ کتاب عہد شاہجہانی یا عالمگیری کی تصنیف تھی۔ اس میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لطائف کا ذکر تھا۔ علاوہ ازیں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ اور ازواج مطہرات کے باہمی مزاح کا بھی ذکر دیکھا گیا کتاب کے نفس مضمون۔ سنہ تالیف اور مصنف کے حالات کے لیے ڈھاکہ میں خط لکھا گیا۔ مگر کوئی اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔

شیخ محمد اخلاص خاں و امق

ڈوہرہ قوم کے کھتری تھے۔ مولوی عبدالحکیم کے صاحبزادہ مولوی عبداللہ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ اور نام محمد اخلاص (معلوم ہوتا ہے نام شیخ محمد یا محمد ہوگا۔ اخلاص خاں اس زمانہ کا ایک اعلیٰ سرکاری خطاب تھا۔ صاحب تذکرہ صبح گلشن نے غلطی سے اخلاص خاں کو اصل نام قرار دیا ہے۔) خاں رکھا گیا۔ یاوریئے طالع نے رفتہ رفتہ اورنگ زیب کے دربار تک پہنچا دیا۔ اور اپنی قابلیت و علمیت کی وجہ سے سر بلند ہو کر امیر الامراء کے مراتب و مناصب تک پہنچے۔ نظم و نثر میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ طرز جدید کی فارسی انشا پردازی میں ایسی مہارت تھی کہ عالمگیر نے بارہا احسنت و آفریں کے کلمات کہے۔ شعر و شاعری کا شغل گو عالم شباب تک ہی رہا۔ مگر علمی مشاغل مرتے دم تک نہ چھوٹے ۱۱۲۳ھ میں (بعہد محمد شاہ بادشاہ) اپنے وطن سیالکوٹ میں وفات پائی۔ دو شعر تذکرہ صبح گلشن سے ہل سکتے ہیں۔

تبرک سمجھ کر درج کرتا ہوں

از تپش آسودن دل شاہد مرگ دل است
 نبض از جنبش چو آسایدرگ خواب فناست
 محتسب مے کشی از دست تو مشکل شدہ است
 شیشہ مے بہ بغل آبلہ دل شدہ است

میر محمد علی رانج

ساوات سیالکوٹ کے ایک نامور خاندان سے تھے۔ ”سرو آزاد“ میں آپ کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی مرحوم نے چند سطور لکھی ہیں۔ انہی میں سے چند الفاظ یہاں لکھے جاتے ہیں۔ آزاد مشرب خوش خلق اور خوش صحبت تھے۔ قلندرانہ طور پر رہتے تھے۔ بزم سخن ہمیشہ گرم رکھتے۔ اور لوگوں کو اپنے کلام سے مستفیض کیا کرتے۔ ۱۱۰ھ میں بزمانہ عالمگیر طویل عمر پا کر مرحلہ زندگی کو طے کیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔ جب میں ۱۱۲ھ میں سفر سندھ سے واپس ہوتا ہوا لاہور آیا۔ تو ایک عزیز جو میرانج کا صحبت یافتہ تھا۔ میرے آنے کی خبر سن کر مجھ سے ملنے آیا۔ اور اسی نے مجھے میرانج کے کچھ شعر سنائے۔ جن میں سے تین درج کئے جاتے ہیں۔

روز وصل از بیم ہجراں تو ام گریاں گذشت
 آہ عید آمد پس از عمرے و درباراں گذشت
 چہ ساں آ موقت پیرمانہ برفتراک سرستن
 ز طفلی آں شکار افکن نے واندکر بستن
 اگر باحق نیازی ہست حاجت نیست تعمیر
 ستون و سقف درویشان ہمیں دست دعا باشد

کتاب ہذا کی تصنیف کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ میر محمد علی صاحب دیوان

بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور) کی خدمت میں چٹھی لکھی۔ انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۲۳ء کے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا کہ ”میں نے محمد علی رانج کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم دیکھا ہے۔ غالباً شاہجہان یا عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔ ٹیک چند نے بہار عجم میں ان کے اشعار کو جا بجا محاورات فارسی کی سند میں لکھا ہے۔ ایک شعر ان کا مجھے بھی یاد ہے

از جوالے سر و قد دیگر بہ بند افتادہ ام

دوستاں رحے کہ از بام بلند افتادہ ام

اس خط کے بعد میں نے بہار عجم (لغت کی لاجواب ضخیم کتاب ہے۔ ٹیک و چند

نے ۱۱۵۲ھ میں بعد محمد شاہ بادشاہ لکھی تھی۔ اس وقت منشی ٹیک چند تخلص بہار کی عمر ۵۳ سال کی تھی۔ میر رانج کے اور شہر بھی بہار عجم میں تلاش سے مل سکتے ہیں۔) کو ٹولا۔ تو مندرجہ ذیل اشعار میر رانج کے وہاں نظر آئے۔

ناز چوں برزد روئے آتشین اونقاب

شرم خوباں را بہ برقع آب در غربال کرد

آب گیر و شکر از شرم کلامی کہ تراست

کبک آتش خورد از داغے غلامی کہ تراست

شیخ رحمت اللہ

اصل نام بدر موہن تھا۔ صاحب حشمت اور امیر کبیر تھے۔ دہلی میں اسلام قبول کیا۔ نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ عالمگیر اس زمانہ میں بادشاہ تھا۔ جب اسے خبر ہوئی کہ ایک نامور اور امیر کبیر ہندو نے برضا و رغبت دین اسلام قبول کیا ہے تو منصب کے علاوہ جاگیر بھی عطا کی۔ سیالکوٹ سے بدر موہن ہو کر دہلی گئے تھے۔ وہاں سے رحمت اللہ اور جاگیر دارو منصب دار ہو کر واپس آئے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ خود کس قدر صاحب علم و فضل تھے۔

لیکن طالبان علم کی پرورش بہت کرتے تھے۔ ان کو خوراک۔ کپڑہ اور وظیفہ دیتے تھے۔ مسجد دو دروازہ جو شہر کے درمیان ہے انہی کی بنا کردہ ہے۔ وفات ان کی فرخ سیر یا محمد شاہ غازی کے ابتدائی زمانہ میں ہوئی ہے۔

دلاور خاں نصرت

اصل نام محمد نعیم تھا۔ ان کے باپ میر عبدالعزیز شہزادہ داراشکوہ کی سرکار میں نوکر تھے۔ داراشکوہ کی برہمی و تباہی اور بالآخر اس کے قتل کے بعد محمد نعیم نے عالمگیر کا دامن پکڑا۔ بادشاہ نے قابل و لائق دیکھ کر اعزاز بڑھایا۔ اور رفتہ رفتہ دو ہزاری منصب اور دلاور خاں خطاب سے سرفراز کیا۔ اس کے بیٹے کا نام میر محمد منعم تھا۔ عنایت اللہ خاں کاشمیری کی لڑکی سے جب اس کی شادی ہوئی تو باپ بیٹوں کے مراتب و مناصب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ عنایت اللہ خاں امرائے عالمگیری میں درجہ اختصاص رکھتا تھا۔ میر منعم شاہ عالم اول کے عہد میں اپنے باپ کے خطاب ”دلاور خاں“ سے ممتاز ہوا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں جب نواب نظام الملک دکن کی صوبیداری پر مامور ہوئے تو دلاور خاں کو۔ کہ فن انشا پردازی و شاعری میں صاحب کمال تھا۔ اپنے ہمراہ دکن لے گئے اور ان کی بڑی عزت و توقیر کی۔ جب نظام الملک کی جگہ امیر الامراء سید حسین علی خاں (برادر سید عبداللہ خاں بادشاہ گر) صوبیدار دکن ہوئے تو انہوں نے دلاور خاں کو رائے چور کا جو آج کل سرکار نظام کا ایک ضلع ہے۔ فوجدار (کمانڈنگ افسر) بنا دیا۔ جب سادات بارہ یعنی دونوں بادشاہ گربھائیوں اور ان کے متعلقین کو بعد محمد شاہ بادشاہ زوال آیا۔ اور نظام الملک آصف جاہ اول نے دکن میں دوبارہ اپنی صوبیداری مستحکم کر لی۔ تو دلاور خاں کو رائے چور سے حیدرآباد میں کہ دارالخلافہ تھا۔ بلا لیا۔ اور اس کے احترام و قربت میں نمایاں اضافہ کیا۔

۱۱۳۹ھ میں بعہد محمد شاہ بادشاہ غازی دلاور خاں نے انتقال کیا۔ اور وصیت کی کہ مجھے میرے مرشد شاہ ابراہیم (حضرت شاہ ابراہیم کا مزار شاہ برہان الدین غریب کے روضہ واقعہ حیدرآباد کی دیوار کے قریب ہے۔) کے پاؤں کی طرف دفن کیا جائے۔ مولانا آزاد بلگرامی ”سرو آزاد“ میں لکھتے ہیں۔ شعر خوب میگوید۔ مضامین مرغوب سے بند۔ و دیوانش مرتب است“ لیکن یہ دیوان یقیناً کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ چند شعر جو سرو آزاد میں درج ہیں۔ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

بسکہ میدارد حیا در پردہ محبوب مرا
بکہ میدارد حیا در پردہ محبوب مرا
مژگاں بہم نہ آید و لدا رہے نقاب است
مژگاں بہم نہ آید و لدا رہے نقاب است
بے ابروئے تو از نظرم دور سے رود
بے ابروئے تو از نظرم دور سے رود
بہ محفلے کہ بیک درد صد دوا بخشند
بہ محفلے کہ بیک درد صد دوا بخشند
نیست ممکن کہ برو بے تو دے خواب مرا
نیست ممکن کہ برو بے تو دے خواب مرا
چشم پوشیدہ تو اں کرد سفر
چشم پوشیدہ تو اں کرد سفر
سیشہ ساعت بود آئینہ دنیا و دیں
سیشہ ساعت بود آئینہ دنیا و دیں
برز مینے کہ او بہ ناز نشست
برز مینے کہ او بہ ناز نشست
بہ عقبے رسیدیم از ترک دنیا
بہ عقبے رسیدیم از ترک دنیا
روز بدیاری نے آید زیاراں دیدہ ام
روز بدیاری نے آید زیاراں دیدہ ام

مولانا جان محمد

مولانا عبدالحکیم کے خاندان سے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بارہ سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ تیمور شاہ کابلی نے بھی بڑی قدر کی۔ ان کے کچھ حالات مولوی عبدالحکیم کی اولاد و احفاد کے بیان میں لکھے جا چکے ہیں۔

مولانا نادری

نہایت عالم و قابل تھے۔ شاعری میں شہرت خاص تھی۔ صبح گلشن (فارسی شعراء کا ایک تذکرہ جو نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کے فرزند نواب سید علی حسن خاں نے ۱۲۹۵ھ میں بزبان فارسی لکھا ہے۔) میں آپ کے متعلق لکھا ہے۔ ”نادری سیالکوٹی از نیکو فکران سیالکوٹ کہ مضاف صوبہ لاہور است۔ نکات دقیقہ اش قابل خوض و غور“۔ آپ کی یادگار صرف ایک رباعی مل سکی ہے۔

من بودم و دوش یار سیمین تن من
جمعے ز نشاط و عیش پیر امن من
ایشاں ہمہ صحدم پراگندہ شدند
جز خون جگر کہ ماند بردامن من

مولانا حاج

وطن سیالکوٹ تھا مگر علمی صحبتوں کی وجہ سے دہلی میں رہتے تھے۔ جامع فضائل ظاہری و باطنی تھے۔ محدث کامل اور فقیہہ متبحر تھے۔ میرزا مظہر جان جاناں دہلوی جن کا اصل نام شیخ شمس الدین العلوی ہے۔ فن حدیث میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا مظہر جان (بہم سو سال ۱۱۹۴ھ ۱۰ محرم کو آپ ایک شقی القلب کے ہاتھوں بمقام دہلی شہید کئے گئے۔) جاناں کو قوت کشفیہ اور اتباع سنت نبویہ اور علم و فضل میں شان عظیم حاصل تھی۔ اسی سے مولانا حاج کی قابلیت کا اندازہ لگالو۔

مولوی عبداللہ

مولوی عبداللہ اپنے کمال علم و فضل اور اپنے درس فقہ و حدیث کی وجہ سے نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ عہد عالمگیری کے نامور علماء میں تھے۔ اور عالمگیر کے دربار میں رسوخ خاص رکھتے تھے۔ مآثر الامراء (جلد اول صفحہ ۳۵۰۔) میں ان کے رسوخ و اقتدار کا ایک واقعہ

درج ہے جس میں لکھا ہے۔ ملا عبداللہ کی دربار عالمگیری میں بڑی رسائی تھی۔ کلانور (گوروا سپور) کا ایک کھتری دیہی داس جو ملا کے ارشد تلامذہ سے تھا۔ اسی کی سفارش و وساطت سے عالمگیر تک پہنچا۔ عالمگیر نے اس کی لیاقت و قابلیت سے خوش ہو کر متاع خانہ کا منصب اور اخلاص کیش کا خطاب دیا۔ بعد میں اندور اور بیدر کی فوجداری (کمانڈنگ افسری) بھی عنایت کی۔ اور سال ۳۹ جلوس میں چہار صدی سہ صد پنجاہ سوار کا جدید منصب عطا فرمایا۔ (اخلاص کیش دیہی داس شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں پہلے مورد عتاب رہا۔ پھر بے قصور ثابت ہو کر دو ہزار پانصدی ایک ہزار سوار کے منصب کو پہنچا۔ اور اخلاص خاں کا خطاب ملا۔)

تذکرہ اکابر اسلام میں مولانا عبداللہ کے متعلق لکھا ہے۔ ”اہل دولت سے کنارہ کش رہنے اور گوشہ نشینی میں باپ سے بڑھا ہوا تھا۔ عالمگیر ایک مرتبہ اجمیر میں تھا۔ اس نے خواجہ بختاور خاں کو مولانا عبداللہ کے پاس سیالکوٹ بھیجا۔ اور عہدہ صدارت تفویض کرنے کے لئے اجمیر بلوایا۔ مولانا نے کہا۔ خواجہ! میری عمر ساٹھ برس کی ہو گئی یہ وقت نوکری ترک کرنے کا ہے نہ کہ نوکری اختیار کرنے کا۔ چنانچہ خواجہ بختاور خاں نا کام واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے وہ عہدہ قلیج خاں کو تفویض کر دیا۔ مولانا عبداللہ ۱۰۹۴ھ میں بعد عالمگیر وفات پا گئے۔“

شیخ ولی محمد ولی

ان کے باپ شیخ منگلو نواب نجابت علی خاں والیے جھجر کی لٹن کے کرنیل تھے۔ یہ خود بھی نواب بہادر جنگ والے بہادر گڑھ (جھجر و بہادر گڑھ کی دونوں ریاستیں بوجہ فسادات غدر ۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گئیں۔ بہادر گڑھ اب ایک معمولی قصبہ ہے۔ اور جھجر دہلی کی ایک تحصیل ہے۔) کے رفیق و مصاحب رہے ہیں۔ تعلیم کی تکمیل اپنے وطن سیالکوٹ ہی میں کی۔ علاوہ دولت و تمول کے دولت سخن سے بھی مالا مال تھے۔ شاہ نصیر دہلوی اور ذوق دہلوی کا زمانہ پایا ہے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء

سے کچھ عرصہ پیشتر ان کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ تذکرہ سخن شعراء میں مندرجہ ذیل دو اردو شعر آپ کی یادگار ہیں۔

کیونکہ بتلاؤں نشاں تمکو شکر اپنا
رتبہ تھا کیا قمر کا کہ کرتا وہ ہمیشہ

شاہ خوشی قاضی سیالکوٹ

راقم الحروف نے سیاحت کشمیر (۱۹۲۲ء) کے ایام میں ایک کتاب منظور گل دستہ (اس کتاب میں ۱۱۱۸ھ تک کے بعض واقعات و حالات منظوم ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے چند سال بعد کی تصنیف ہے۔) سخن کے نام سے دیکھی۔ جس کے مصنف جوت پرکاش شوقی ایک ہندو بزرگ تھے اور عہد عالمگیری میں کشمیر اور لاہور کی نظامتوں میں اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک منظوم خط شاہ خوشی کے نام لکھا ہے جو اس زمانہ میں سیالکوٹ کے قاضی تھے۔ اور عالمگیری کے دربار میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

سحر گاہ نویدے برسیدم بگوش
عجب عند لب است نادر بیاں
چورہ یافت در خلوت خاص گفت
دعائے رسانید باہنیت
بیاں کرد آنکہ کمالات خویش
متاع گرانمایہ پیروں کشید
خداوند را بسکہ محفوظ ساخت
جوابے بصد مہربانی شنید
بہنگام رخصت چنین گفتمش
سلائے ازیں بندہ خواہی رساند

کہ شخھے است از دوستان خوشی
کہ مے آید از بوستان خوشی
کہ مے آیم از آستان خوشی
بصد آب و تاب از بیان خوشی
کہ با ایست از کاروان خوشی
زکان خوشی بل وکان خوشی
بفرس نو و ترجمان خوشی
رواں شد بسوئے جہان خوشی
کہ ہر کہ ری در مکان خوشی
مخلو تنگہ خاد مان خوشی

مختصر تاریخ سیالکوٹ

سیالکوٹ کی تواریخیں

سیالکوٹ کی دو تواریخیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ ایک بندوبست کی تاریخ ہے۔ اور ایک کا نام ”وقائع زمستان حصار“ یا تاریخ سیالکوٹ ہے۔

تاریخ بندوبست سیالکوٹ بہت بڑے حجم کی کتاب ہے۔ اس میں تاریخی حالات بہت کم ہیں۔ قوموں اور گوتوں اور ذیلدار یوں اور نمبردار یوں اور گاؤں کی ذات وار تقسیموں اور قوموں کے رسم و رواج کے حالات اس میں زیادہ درج ہیں۔

”وقائع زمستان حصار“ کا نام تو تاریخ سیالکوٹ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے بعض واقعات افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ مصنف نے تحقیق و تفتیش اور افسانہ نویسی کو تاریخی واقعات سے تطبیق کرنے میں زیادہ محنت سے کام نہیں لیا۔

سیالکوٹ کا ڈسٹرکٹ گزٹیئر بھی قابل دید ہوگا۔ لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہو سکا۔ سیالکوٹ اتنا قدیم شہر ہے۔ اور اس کا تعلق ملک کے پالیٹکس سے اس قدر رہا ہے کہ تاریخ فرشتہ۔ تاریخہائے کشمیر۔ سیر المتاخرین۔ تاریخ ہائے پنجاب اور بعض اور تاریخوں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آ جاتا ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ متذکرہ صدر تاریخوں سے سیالکوٹ کے متعلق جس قدر معلومات مجھے حاصل ہوں۔ وہ میں مختصر طور پر اس ضمیمہ میں درج کروں۔

سیالکوٹ کی وجہ تسمیہ

قریباً پانچ ہزار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا۔ راجہ شل نے جو نکل اور سہد یو کا ناموں اور پانڈو کا رشتہ دار تھا۔ اس کو آباد کیا۔ اس زمانہ میں سیالکوٹ کا نام شاکل

تھا۔ چنانچہ مہا بھارت کے کرن پرب میں راجہ شل کی نگری ”شاکل“ کا اس طرح ذکر ہے۔
کہ یہ نگری اپکاندی کے کنارہ پر مردیس میں واقع ہے۔ مردیس اس زمانہ میں پنجاب کا
نام تھا۔ اور سیالکوٹ کی مشہور ندی ایک اس زمانہ میں اپکاندی کہلاتی تھی۔

سیالکوٹ کی وجہ تسمیہ میں ایک اور بیان بھی نظر سے گذرا ہے۔ جس کو زیادہ تر
قرین قیاس بتایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ راجہ بکر ماچیت کے زمانہ میں جس کو ایک ہزار نو سو
اسی سال گذر چکے ہیں۔ راجہ شالباہن نے یہاں ایک قلعہ بنوایا۔ قلعہ کو پنجابی زبان میں
کوٹ کہتے ہیں۔ اس لیے قلعہ کا نام شالکوٹ اور بعد میں سیالکوٹ مشہور ہو گیا اور اسی
نام سے شہر کی شہرت بھی ہو گئی۔ راجہ شالباہن کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو تارک الدنیا اور
فقیر ہو کر شہزادہ پورن سے پورن بھگت کہلایا۔ جس کے کئی قصے پنجابی زبان میں تصنیف ہو
گئے ہیں۔ اور جس کے گیت پنجاب میں ہر جگہ گائے جاتے ہیں دوسرا رسالو (بیان کیا
جاتا ہے کہ یہی راجہ رسالو راجہ نل کا داماد تھا۔ جو اس زمانہ میں ٹیکسلا متصل سرانے کالا ضلع
راولپنڈی کا راجہ تھا۔ اسی مقام (ٹیکسلا) پر انگریزوں نے ۱۹۱۴ء) سے کھدائی کا کام کئی
میلوں میں شروع کر رکھا ہے۔ بہت سے بت۔ مورتیاں سکے اور برتن اس زمانہ کے
کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔) جس کے متبنی راجہ کرم کی اولاد ملک مانجھ نواح لاہور
میں عرصہ دراز تک برسر اقتدار رہی۔

خاندان غزنوی و غوری کا تعلق سیالکوٹ سے

راج شالباہن کے زمانہ بکر ماچیتی سے لیکر جو سال ہجری سے قریباً ۶۳۹
سال پیشتر شروع ہوتا ہے۔ ۴۰۰ھ یا ۱۰۳۹ سال کے طویل زمانہ تک سیالکوٹ کے حالات
پر بالکل تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں سیالکوٹ کی سرزمین نے کیا کیا انقلاب دیکھے

ہوں گے اور اس سرزمین نے کس کس دل و دماغ کے انسان پیدا کئے ہوں گے۔ لاہور کے برہمن راجگاں جے پال و اتند پال وغیرہ کی حکومت تمام پنجاب پر تھی۔ اور گوسیا لکوٹ میں ایک الگ راجدہانی تھی لیکن وہ راجہ پنجاب کے راجہ کے ماتحت ہی سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۱۲ھ میں یعنی راجہ شالباہن کے زمانہ سے ایک ہزار اکان سال کے بعد محمود غزنوی پنجاب میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں بھی سیالکوٹ کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ تمام پنجاب معہ سیالکوٹ غزنوی حکومت کے ماتحت تھا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ محمود نے سیالکوٹ کی حکومت راجہ قدیم کے نام پر ہی رہنے دی تھی۔ البتہ اس کی نگہداشت اور اس کی نقل و حرکت کا خیال رکھنے کے لئے دس غزنوی سپاہی قلعہ میں متعین رہتے تھے۔

تاریخ فرشتہ میں شہاب الدین غوری کے حالات میں لکھا ہوا ہے۔ جب ۵۸۰ھ میں شہاب الدین غوری دوسری مرتبہ لاہور آیا۔ تو خسرو شاہ غزنوی وہاں کا حاکم تھا۔ شہاب الدین نے لاہور کو غارت و تاراج کرنے کے بعد سیالکوٹ کا رخ کیا۔ وہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اور حسین خرقیل کو قلعہ دار اور سیالکوٹ کا حاکم مقرر کیا۔

جب شہاب الدین واپس چلا گیا تو خسرو ملک جو جان چھپائے پھرتا تھا۔ سیالکوٹ کے پہاڑوں (جموں کے پہاڑوں کا سلسلہ زمانہ قدیم میں کوہستان سیالکوٹ ہی کہلاتا تھا۔ اس زمانہ میں جموں کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک معمولی چکلہ شمار ہوتا تھا۔) سے باہر نکلا۔ اور گلگھڑوں اور دوسرے اہل ملک کی مدد سے قلعہ سیالکوٹ پر حملہ آور ہوا۔ اور محاصرہ کر کے حسین خرقیل کو بہت تنگ کرنے لگا۔ شہاب الدین کو خبر ہوئی۔ وہ ۵۸۲ھ میں لشکر جرار لے کر پھر سیالکوٹ آیا۔ اور خسرو اور اس کے بیٹے ملک شاہ اور اس کے دیگر اہل خاندان کو باندھ کر غزنی بھجوا دیا۔ جہاں سب موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

پنجاب میں غزنوی خاندان کی حکومت قریباً پونے دو سو سال تک رہی ہے اور غزنوی حکومت کے بعد پنجاب پر خاندان غلاماں۔ بلبن اور خلجی کا عہد بھی قریباً اسی قدر عرصہ تک رہا ہے۔ مگر جو واقعہ خسرو اور شہاب الدین غوری (بہاول شہید کے مزار کے متصل جو کاروں کاٹبہ ہے وہ شہاب الدین غوری کے زمانہ کا قلعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جہاں کار قوم کے سپاہی تعینات تھے۔ وہ قلعہ انہی کے نام سے کاروں کا قلعہ مشہور ہوا۔ جو اب بوجہ انہدام و تباہی کا کرو کاٹبہ کہلاتا ہے۔) کا بیان کیا جا چکا ہے۔ ساڑھے تین سو سال کی تاریخ سیالکوٹ۔ اس کے سوا اور کوئی واقعہ نہیں بتاتی۔

سیالکوٹ شاہان تغلق کے عہد میں

غزنوی عہد حکومت سے لیکر خاندان تغلق کے ابتدائی ایام تک پنجاب و ہندوستان میں اسلامی حکومت کو ساڑھے تین سو سال کا جو عرصہ گزرا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مسلمانوں کی آبادی ان ممالک میں بڑھتی دولت کی طرح ترقی کر رہی تھی۔ پشاور۔ راولپنڈی۔ خوشاب۔ بھیرہ۔ جہلم۔ سیالکوٹ۔ لاہور۔ ملتان۔ دہلی۔ اجمیر۔ ان سب مقامات میں مسلمانوں کی معقول تعداد تھی۔ بیرونجات سے بھی بہت سے مسلمان پنجاب و ہند میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور صوفیاء و مشائخ اسلام کے حسن عمل اور خلق محمدی سے بھی بہت سے غیر مسلمان۔ مسلمان ہو چکے تھے۔ اور ہور ہے تھے۔ باوجود اس افزودنے عروج و اقبال کے مسلمان بادشاہوں نے ان ہندو راجگاں کا راج پاٹ۔ جنہوں نے باجگزار ہونا قبول کر لیا تھا برابر قائم رکھا ہے۔ انہی باجگزاروں میں سیالکوٹ کا ہندو راجہ بھی تھا۔ لیکن جب تغلق عہد میں دارالسلطنت (دہلی) میں کچھ ابتری و بد نظمی کا ظہور ہوا۔ تو راجہ سہپال (معلوم نہیں یہ راجہ جے پال۔ اند پال وغیرہ والیان لاہور کے خاندان سے تھا۔ یا کسی اور

خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہر حال وہ ان کا ہم لقب اور ہم قوم (برہمن) ضرور تھا۔) نے جو اس وقت سیالکوٹ کا باجگزار حکمران تھا۔ اور موقعہ کی تاڑ میں تھا۔ اپنے مشیروں کے صلاح و مشورہ سے خود سری اختیار کر لی۔ کسی مبارک ساعت کے لئے منجم اور برہمن بلائے گئے۔ اور ان کو تاکید کی گئی کہ اپنے علم کے زور سے کوئی ایسا جادو بتاؤ۔ اور ایسا منتر پھونکو۔ کہ دشمن کامیاب نہ ہو سکے۔

نجومیوں اور جوتشیوں نے غور و فکر کے بعد عرض کیا۔ اگر انسانی خون قلعہ کے چاروں گوشوں اور قلعہ کی دیواروں پر چھڑکا جائے۔ تو بہت مبارک ہے۔ اور امید قوی ہے کہ دشمن کبھی ہم پر فتح مند نہ ہو سکے گا۔

قلعہ سیالکوٹ کی دیواروں پر ایک مسلمان کے

خون کا چھڑکاؤ

اسلامی خون کے سوا اور کونسا انسانی خون بہ آسانی دستیاب ہو سکتا تھا۔ راجہ کے آدمیوں نے ایک غریب بڑھیا مسلمان عورت کے جوان فرزند کو پکڑا۔ اور بہ قصور و بے جرم اس کو بیدردانہ طور قتل کر کے اس کا خون قلعہ کی دیواروں پر چھڑکا گیا۔

میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگ گئے دیوار میں

بڑھیا ماما کی ماری روتی پیٹتی سیالکوٹ سے باہر نکل آئی۔ بیٹے کے فراق و ماتم

میں شہر بشہر اور دربدہ پھرتی ہوئی سید امام علی (تاریخ سیالکوٹ صدی یعنی ”واقع رستان

حصار“ میں لکھا ہے کہ بڑھیا مظلوم پہلے حضرت سید یعقوب زنجانی صدر دیوان کے پاس

لاہور گئی۔ انہوں نے سید علی لائق کے نام رقعہ لکھ دیا۔ کہ بادشاہ دہلی سے کہہ کر مظلومہ کی

واورسی کرادو۔ تاریخی لحاظ سے بڑھیا کی ملاقات حضرت صدر دیوان سے غلط ثابت ہوتی

ہے کیونکہ حضرت صدر دیوان۔ حضرت شاہ حسین زنجانی کے ہمراہ جو حضرت داتا گنج بخش لاہوری کے پیر بھائی تھے تیسری صدی کے اواخر میں لاہور آئے ہیں۔ اور امام علی لاحق کا واقعہ آٹھویں صدی ہجری کے وسط کا ہے۔ (لاحق بن سید حسن مکی کی خدمت میں آئی جو عہدہ و منصب شاہی ترک کر کے کوہستان کا نگرہ کے نواح میں گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے تھے۔ آپ نے راجہ سہپال کے اس ظلم و ستم کی یہ دردناک کہانی سن کر بڑھیا سے امداد کا وعدہ کیا۔ اور دلجوئی کے کلمات زبان سے فرمائے۔

چند روز کے بعد حسن اتفاق سے سلطان فیروز (عہد حکومت ۵۲ھ لغایت ۹۹ھ وفات بعمر ۹۰ سال۔) شاہ تغلق کوہستان سرمور کی طرف جاتا ہوا اسی جگہ آ نکلا۔ اوز ڈیرہ خیمہ امام علی لاحق کے گرد و جوار میں لگا دیا۔

حضرت امام صاحب نے بادشاہ سے اس غریب بڑھیا کی المناک داستان اور راجہ کی حماقت و سنگدلی کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے امام صاحب کے سپرد ایک عظیم لشکر کر دیا۔ اور کہا کہ اس کا قرار واقعی انتظام کر کے خلق خدا کو اس کی حماقتوں سے نجات دلائیے۔ یہ واقعہ ۵۷ھ (سلطان فیروز شاہ تغلق اپنی طویل عمر اور اپنے طویل عہد حکومت میں پانچ مرتبہ پنجاب میں آیا ہے۔ اول ۵۳ھ کو بطریق سیر و سیاحت کوہستان سرمور کی طرف۔ دوم ۵۴ھ میں کلانور شکار کھیلنے آیا۔ جہاں عمارات بھی تعمیر کرائیں۔ سوم ۵۷ھ میں پھر سرمور آیا۔ اسی سنہ میں ہانسی کی طرف قلعہ فیروز اللہ شہر فیروز آباد۔ آباد کیا۔ اور نہریں اور تالاب کھدوائے۔ چہارم ۶۲ھ میں سرہند آیا۔ وہاں سے نگر کوٹ کا نگرہ گیا۔ جہاں راجہ نے مصر اور کوہستانی رئیسوں کے متابعت کی پانچویں مرتبہ ۸۱ھ میں کوہ سمانہ۔ انبالہ۔ شاہ آباد اور سر میں آیا۔ تاریخ سیالکوٹ میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ ۵۷ھ میں کوہستان کا نگرہ آیا۔ اور تاریخ فرشتہ میں کوہستان سرمور لکھا ہے جو زیادہ صحیح ہے لیکن ان دونوں کو

ہستانوں کا زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ بلکہ باہم ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے مصنف تاریخ سیالکوٹ کی یہ غلطی چنداں قابل لحاظ نہیں ہے۔ (کامیاب کیا جاتا ہے۔)

راجہ سیالکوٹ کے بھائی سے امام صاحب کی جنگ

حضرت امام صاحب غازیان جانباز کو ہمراہ لیکر اپنے مقام رودل سے روانہ ہوئے منزل بہ منزل جب جالندھر پہنچے تو آپ کے بھائی سیدنا امام ناصر الدین بیمار ہو گئے۔ اور چند روز علالت کے بعد یہیں انتقال فرما گئے۔ مزار آپ کا شہر جالندھر میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ بھائی کی تجہیز و تکفین کے بعد امام صاحب سیالکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔

راجہ سہدپال کا بھائی راجہ جگت پال جگت پور میں حکومت کرنا تھا۔ وہ سید راہ ہوا راجہ جگت پال اور اس کی فوج کے ہزار ہا آدمی مارے گئے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہوا۔ اور سید میر باز خاں المشہور سید میراں برخوردار بھی شہید ہو گئے۔ جن کا مزار اب تک جگت پور میں موجود ہے۔

تاریخ سیالکوٹ صدی میں لکھا ہے۔ جگت پور کا نام غازیان اسلام نے اس فتح کی یادگار میں پرسور رکھا۔ جو رفتہ رفتہ پرسور کے نام سے بدل گیا۔ لیکن بعض لوگ پرسور کو پرس رام کسی ہندو کا آباد کردہ بتاتے ہیں۔

ایک اور شجاع اسلام سید غالب علی غازی نام مقام ہنس پور لشکر جزار لیکر گئے۔ جو ٹھا کر ہنس پال برادر زادہ راجہ سہدپال کا تعمیر کردہ تھا۔ ٹھا کر اور اس کے سرداران نامدار مارے گئے۔ سید غالب علی غازی بھی شہید ہو گئے۔ مگر آخر میں فتح مسلمانوں ہی کی ہوئی۔ اس مقام کا نام اب آدم دراز ہے۔ یہاں گنج شہیداں موجود ہے۔ اور مسلمان ان غازیان اسلام پر فاتحہ پڑھتے رہتے ہیں۔

امام صاحب کی شہادت سیالکوٹ میں!

آخر امام سید علی لائق کا لشکر سیالکوٹ پہنچا۔ راجہ سہپال نے شہر اور قلعہ کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ اس پر فتح پانا بظاہر بڑا مشکل تھا۔ امام صاحب نے ندی ایک کے جنوب کی جانب قیام کیا۔ دو دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ مگر امام صاحب کی فوج ایک سے پار نہ ہو سکی۔ تیسرے دن کے معرکہ عظیم میں مسلمان ندی سے پار ہو کر شہر میں داخل ہو گئے۔ اور راجہ قلعہ میں محصور ہو گیا۔

کئی دنوں تک محاصرہ قائم رہا۔ مسلمانوں نے فتح حاصل تو کر لی۔ مگر ان کے بڑے بڑے نامور افسر مارے گئے۔ خود امام صاحب زخمی ہو گئے۔ اور زخم اس قدر گہرے اور شدید نکلے۔ کہ آپ جانبر نہ ہو سکے۔

امام صاحب اور ان کے دیگر شہداء کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جہاں اور جس حالت میں کسی کا انتقال ہوا ہے۔ اسی جگہ اور اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا ہے۔

قلعہ کے چاروں طرف شہدائے اسلام کے مزارات متفرق مقامات پر نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں امام صاحب کا عالیشان پختہ چونہ گچ روضہ ہے وہاں صدہا مزارات ایک دوسرے کے پہلو میں موجود ہیں۔ اور ہر شہید دوسرے شہید کے متعلق زبان حال سے کہتا ہے یوں دفن میرے ساتھ دل بیقرار ہے چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہے اس کثرت مزارات سے ان جانبازان اسلام کی غیرت و حمیت عجیب عبرت و حیرت کا نقشہ دکھاتی ہے۔

(۱۲) مارچ ۱۹۱۰ء کو ایک دوست چاندین کی تحریک سے مندرجہ ذیل اشعار لاہور میں حضرت امام صاحب کے متعلق لکھے گئے جو حضرت کے مزار پر حاضر ہو کر پڑھے گئے

یاد گارسید مظلوم اے بیکس امام
 اے خدائے دین حق اے مرجع ہر خاص و عام
 سرچلا جائے نہ جانے پائے دامن دین کا
 ناز کر قسمت پہ اپنی اے زمین سیالکوٹ
 تیرے دم سے نام کچھ اسلام کا باقی ہے یاں
 مٹ گئے خود پر دیا مٹنے نہ مذہب کا نشان
 میں چراغ دین ہوں بجھنا نہیں میرا روا
 آج حاضر ہیں مزار پاک پر تیرے غلام
 پھونکدے کانوں میں ان کے بھی کوئی ایسا کلام
 دیکھتا رہ جائے استقلال دشمن دین کا
 تجھ میں ہے ایسا ذینہ جس پہ اک عالم ہے لوٹ
 تیری برکت سے ہمارا شہر ہے رشک جناں
 ڈھیر قبروں کے نہیں غیرت کے ہیں گنج نہاں
 جس سے روشن دین ہو وہ روشنی کچھ عطا

مزار مبارک پر ہر جمعرات کو مسلمان اس کثرت سے آتے ہیں کہ خاصہ میلا ہو

جاتا ہے۔ عیدین کے میلوں کے علاوہ ایام محرم میں ۸ تا ۱۱ محرم اس روضہ مبارکہ پر عظیم الشان میلہ ہوتا ہے جس میں تمام ضلع کے لوگ آتے ہیں۔ وفات کا قطعہ تاریخ جو تاریخ سیالکوٹ میں درج ہے حسب ذیل ہے

چوں براہ ذوالجلال ذوالکرام
 از پئے سال شہادت بانگ حق
 از سر یاد الہ و برتری
 داد جاں را آں علی لاحق امام
 در رسید از لطف درگوش انام
 رفت از دنیا شہ دارالسلام

۵۷۵۷

راجہ سہنپال اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ دروازہ قلعہ کے اندر جو مزار ہے وہ سید سرخ رو صاحب کا ہے۔ جو قلعہ کے عین دروازہ کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ غریب بڑھیا بھی اسی لڑائی میں شہید ہو گئی۔ اس کی اور بیٹی کی قبر (جس کا پتہ بعد

میں لگایا گیا تھا) بھارت پختہ قلعہ کے اندر موجود ہے۔ اس واقعہ کے بعد سیالکوٹ کی تاریخ میں ہندو عہد حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سیالکوٹ اور سلطان حسن شاہ فرمانروائے کشمیر

کشمیر جو آج تمام جہان کی برائی اور بزدلی کا مخزن بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے باشندوں کو دیکھ کر ان کے دل کی تمام کیفیت بلکہ ملک کشمیر کی تمام واماندگی و در ماندگی پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں اس کی فتوحات کا پرچم حدود کشمیر سے صد ہا میل دور تک لہراتا رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس کا ہر فرد یہی پھرن اور یہی لمبے درویشانہ کرتے پہن کر رخ دو اسپہ روانم یہ میدان جنگ کا نعرہ لگاتے ہوئے کہتا تھا

(ملاحمید اللہ اسلام آبادی کا کشمیری کا اکبر نامہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ اکبر نامہ فردوسی کے شاہنامہ کی طرز پر ہے۔ حمید۔ فردوسی پر چوٹ کرتا ہوا کہتا ہے ازیں پیش گر نامہ ہا گفہ اند، بمشت زرے گوہرے سفتانند۔ نہ کردم من این داستان بہروز کہ بہر خذف کس نریزد گہر، فرو شم گہر مقصدم سود نیست۔ نگاہم سوئے دست محمود نیست۔ پھر اپنی سخن گوئی سخن ریزی کی داد فردوسی طوسی ہی سے لیتا ہے اور کہتا ہے کہند بر من از گنبد آبنوس۔ ہزار آفریں روح دانائے طوس۔ یہ اکبر نامہ ۱۲۶ھ میں تصنیف ہوا ہے اور اب تک غیر مطبوع ہے۔)

کے راہمن تاب ناورد کو	فراخ است میداں ولے مرد کو
کے کو تواند برآمد بہ صف	کہ تیغم ہنو است عریاں بکف
بہ دیدن شود خصم راز ہرہ آب	کجا زہرہ دارد کہ آرد جواب

آج جموں کے فرمانروا کشمیر کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں پر جس ”انصاف و مساوات“ اور ”ہمدردی و بے تعصبی“ سے حکومت کر رہے ہیں۔ اخبار بین حضرات اور ان

اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے جو ہر سال کشمیریوں کے جم غفیر کو پنجاب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں محنت مزدوری کرتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں۔ اور پھر ان کے ملک کی طویل داستان المناک بھی سنتے ہیں۔ جموں و کشمیر کے انہی فرمانرواؤں کے ایک بزرگ راجہ عجب دیوالیے لئے جموں کو جب تاتار خاں حاکم لاہور نے سخت تنگ کیا اور اس کو اپنی جان و آبرو بچتی نظر نہ آئی تو اس نے اسی ”بزدل و کم ہمت“ کشمیر کے مسلمان فرمانروا سلطان حسن شاہ کو اپنی مدد و حمایت کے لیے لکھا۔ سلطان حسن شاہ خود تونہ آسکا۔ مگر اس نے اپنے ایک نامور افسر ملک تازی بٹ ایک جرار فوج کے ہمراہ راجوری کے رستے جموں بھیجا۔ تاتار خاں کو بھی خبر ہوئی۔ وہ بھی مقابلہ کے لئے لاہور سے باہر نکلا۔ سیالکوٹ کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ جنگ عظیم میں کشتوں کے پستے لگ گئے۔ تاتار خاں نے جب دیکھا کہ اس کی فوج گاجر مولیٰ کی طرح کٹی جا رہی ہے۔ تو بے حوصلہ ہو کر اور جان بچا کر بھاگ گیا۔ تازی بٹ مظفر و منصور شہر میں داخل ہوا۔ اور اس کی فوج نے اس قدر لوٹ شہر میں مچائی کہ سیالکوٹ جو اس قدر آباد و بارونق شہر تھا اجاڑ نگر ہو گیا۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے۔

”تازی بٹ نے تاتار خاں کو شکست دے کر سیالکوٹ کو خراب اور ویران کر دیا“۔ یہ واقعہ ۸۸۰ھ سے ۸۹۲ھ تک کے درمیان ہوا ہے کیونکہ یہی زمانہ سلطان حسن شاہ کی حکومت کا تھا۔

سیالکوٹ عہد بابر میں

ہندوستان اور پنجاب میں خاندان لودھی کی حکومت تھی۔ کہ ۹۲۶ھ میں ظہیر الدین بابر تغیر لاہور کے لئے کابل سے باہر نکلا۔ اور سیدھا سیالکوٹ پہنچا۔ شہر کے لوگوں نے بجز تمام اپنے قائم مقام اور سرکردہ و منتخب لوگ بابر کے حضور میں بھیجے اور اطاعت اختیار کر کے جان کی امان اور مال و ناموس کی حفاظت چاہی۔ بابر نے اہل سیالکوٹ کی التماس

پذیرا کی۔ اور اپنی فوجوں کو اہل شہر کی ایزاد ہی اور لوٹ مار سے بہ سختی تمام باز رکھا۔ ۹۳۰ھ میں بابر ابراہیم لودھی کے رشتہ داروں بالخصوص حاکم پنجاب دولت خاں لودھی کی دعوت پر چوتھی مرتبہ وارد ہند ہوتا ہے۔ اور سیالکوٹ لاہور اور دیپال پور تک کہ اس زمانہ میں نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ پہنچتا ہے۔ بابر نے ہر جگہ اپنے آدمی مقرر کئے۔ سیالکوٹ کی حکومت خسرو کو کلتاش۔ اور لاہور کی حکومت امیر عبدالعزیز کے سپرد کر کے آپ واپس کابل چلا گیا۔

دولت خاں لودھی نے بابر کو اپنے ملک میں دعوت دیکر جو حماقت کی تھی۔ بابر کے جانے کے بعد اس پر اس کو ندامت آئی اور اس نے تلافی مافات کے لئے پانچ ہزار شروانی افغان سواروں کے ساتھ خسرو کو کلتاش پر حملہ کر دیا۔ خسرو کو بھی دولت خاں کے منصوبوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس نے بابر کے پاس ایسے آدمیوں کے ہاتھ لودھیوں کے دغا و فریب کی اطلاع بھیجی جو ہوا کی طرح گئے اور بگولے کی طرح ۹۳۲ھ، ۱۵۲۵ء میں بابر کو ہمراہ لیکر آئے۔

امیر عبدالعزیز لاہور کا بابر کی گورنر اور دیگر امرائے بابر کی مغلوں کی ایک جرار فوج لیکر خسرو کو کلتاش حاکم سیالکوٹ کی مدد کو گئے۔

سلطان علاؤ الدین (علاؤ الدین کو عالم خاں بھی کہتے تھے۔ یہ سلطان بہلول لودھی کا بیٹا۔ اور سلطان ابراہیم لودھی کا چچا تھا۔ مگر بھتیجے کے سلوک سے جہاں اور امرائے لودھی نالاں تھے۔ یہ بھی فریاد کناں رہتا تھا۔ تاریخ ذکاء اللہ میں تو یہ لکھا ہے کہ سلطان علاؤ الدین بابر کے سیالکوٹ آنے کی خبر سن کر لاہور سے اس کے پاس آ گیا۔ مگر مصنف حیات لودھی اپنی کتاب کے حصہ سوم صفحہ نمبر ۱۶۰ پر لکھتے ہیں کہ عالم خاں عرف سلطان علاؤ الدین نواح سرہند میں ابراہیم سے شکست کھا کر بابر کے پاس کابل چلا گیا تھا۔ بابر نے اپنی روانگی لاہور سے پیشتر ۱۹۳۲ھ میں اس کو اپنے لشکر اور امراء کے ساتھ ہندوستان بھیجا۔ وہ سیالکوٹ آیا۔ اور نواح کے رئیسوں کو مطیع کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ اور یہاں سے ۴۰ ہزار کا لشکر لیکر دہلی کی

طرف روانہ ہوا۔ اور ابراہیم سے شکست کھا کر واپس آیا۔ اسی واپسی میں وہ سیالکوٹ میں
 بابر سے ملا۔ (لودھی جو ابراہیم لودھی بادشاہ ہند سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اور خواجہ حسین دیوان
 لاہور جو خزانہ لاہور کا افسر اعلیٰ تھا۔ اور کئی امراء بابر کے آنے کی خبر سن کر سیالکوٹ آ گئے۔

۱۲ ربیع الاول ۹۳۲ھ جمعہ کا دن تھا کہ بابر اپنے بیٹے شاہزادہ ہمایوں اور دس
 ہزار فوج کے ساتھ سیالکوٹ میں داخل ہوا۔ اس نے سیالکوٹ آ کر اہل لاہور کو تو یہ پیغام
 بھیجا کہ تم لوگ اگر امراء بابر کی مخالفت سے باز رہو گئے۔ تو تم کو کسی طرح کی تکلیف نہ
 دی جائے گی۔ اور اپنے آدمیوں کو جو لاہور میں تھے۔ کہلا بھیجا کہ وہ سیالکوٹ یا پرسرور
 (پسرور) آ کر میری سپاہ کے ساتھ شامل ہو جائیں تاکہ ہماری جمعیت جگہ جگہ منتشر نہ ہو۔

بابر پسرور میں تھا کہ اس کو اطلاع ملی کہ غازی خاں نے تیس چالیس ہزار فوج جمع
 کی ہے۔ اور اس کے بوڑھے باپ (دولت خاں لودھی) نے ایک کی بجائے دو تلواریں کمر
 میں کس لی ہیں۔ بابر کو لودھیوں کی خانہ جنگیوں کا حال معلوم تھا۔ اس لئے باوجود غیر ملک میں
 اپنی تھوڑی سی فوج رکھنے کے بھی وہ ہراساں نہ ہوا۔ آخر اس نے نہ صرف ان باپ بیٹوں کا
 استیصال کیا۔ بلکہ ۱۸ رجب ۹۳۲ھ بمطابق ۱۵۲۵ء روز جمعہ کو سلطان ابراہیم لودھی پر بھی فتح
 پالی۔ اور ہندوستان کی عظیم مملکت کا بادشاہ ہو گیا۔ اور سیالکوٹ کی حکومت بدستور خسرو کو
 کلتاش کے سپرد رہی۔

سلیم شاہ سوری سیالکوٹ میں

۹۳۲ھ عہد بابر سے لیکر بیس سال تک سیالکوٹ کے حالات پر پھر تاریکی
 چھا جاتی ہے۔ ۹۵۲ھ سے ۹۵۵ھ مطابق ۱۵۵۳ء کے درمیان سلیم شاہ سوری بن شیر شاہ
 سوری کے زمانہ میں پھر سیالکوٹ ایک مرتبہ صفحات تاریخ پر اس موقع پر نظر آتا ہے جب

نیازی پٹھان سوری افغانوں سے شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ اور سلیم شاہ ان کا تعاقب کرتا ہوا سیالکوٹ تک آ پہنچتا ہے۔ اسی جگہ نیاز یوں کا سب سے بڑا سرغنہ ہیبت خاں معہ اپنی ماں اور فرزندوں کے سلیم شاہ کے پاس عنقوت قصیرات کے لئے پیش ہوتا ہے۔ سلیم شاہ نے کئی دن تک نزول اجلال سیالکوٹ میں رکھا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں میاں وارث کشمیری سیالکوٹ میں ایک نامور بزرگ ہے جو مال گذار اور تعلقدار بھی تھا۔ اور جس کے حسن انتظام سے سب لوگ خوش تھے۔

سیالکوٹ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں

۱۵۵۶ء الغایت ۱۰۰۵ھ

اکبر کے عہد میں ہندوستان کی تقسیم صوبوں کے علاوہ باؤنیوں پر بھی سیالکوٹ بھی ایک باؤنی کا صدر مقام تھا۔ جس کے ماتحت علاوہ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے ۵۲ بڑے بڑے دیہات بھی تھے یہی ۵۲ دیہات ایک باؤنی کہلاتے تھے جموں (جموں اس زمانہ میں تو ایک بے حقیقت گاؤں سا تھا۔ اب اس کی آبادی ۳۳ ہزار کے قریب ہے مہاراجہ جموں و کشمیر کا گرامی صدر مقام ہے۔) ایمن آباد (ریاست جموں و کشمیر کے نامور وزراء دیوان امیر خسرو دیوان جوالا شہائے۔ دیوان کرپارام۔ دیوان گوبند سہائے۔ دیوان انت رام و دیوان امر ناتھ اسی ایمن آباد کے رہنے والے تھے۔ اب اس اعلیٰ خاندان سے صرف دیوان دھپت رائے جاگیردار جو دیوان نچھن داس کے بیٹے ہیں۔ باقی ہیں۔) سوہدرہ ۳ عہد شاہجہان کا مشہور ہندو شاعر جنر بھان تخلص برہمن اسی سوہدرہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے یہیں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ، کہ چوں خراب سود خانہ خدا گردو، سوہدرہ بہت پرانا قصبہ ہے۔ اب بھی اس میں پرانے آثار نظر آتے ہیں۔ بیان کیا

جاتا ہے کہ محمود غزنوی کے غلام آیاز نے اس کو آباد کیا تھا۔ جو لاہور کا نائب حاکم بھی رہا ہے اور جس کا مقبرہ لاہور میں اب تک موجود ہے۔ (شیخوپورہ۔) (شیخوپورہ اکبر کے زمانہ میں سلیم کے ابتدائی نام شیخو بابا پر آباد ہوا۔ سلیم نے بادشاہ ہو کر اس کا نام جہانگیر آباد رکھا۔ مگر وہ مشہور نہ ہو سکا۔ رانی جنداں اسی شیخوپورہ میں قید رہی تھی اب یہ مقام مع اپنے وسیع قلعہ کے راجہ فتح سنگھ رئیس لاہور کی جاگیر میں ہے۔ شیخوپورہ چند سالوں سے ضلع کا صدر مقام ہو گیا ہے۔ اور اس کی رونق و آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔) یہ سب مقامات سیالکوٹ کے ماتحت تھے۔

اس زمانہ میں دریائے چناب کے پار سے ڈاکو اور رہزن آتے تھے اور چھاپہ مار کر چلے جاتے تھے۔ حکام سیالکوٹ جن کے ماتحت وہ علاقہ تھا۔ ان کے انتظام سے عاجز تھے۔ اکبر جب ۹۹۴ھ کے بعد سفر کشمیر سے واپس آیا۔ اور بھمبر کے قرب و جوار کے لوگوں نے گجروں کی لوٹ مار کی شکایت کی تو اکبر نے گجرات کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا۔ جہاں سیالکوٹ سے بھی بہت لوگ آکر آباد ہوئے اور اس گاؤں کو جس میں گجروں کی آبادی دیگر تمام اقوام سے زیادہ تھی سیالکوٹ سے بالکل الگ کر دیا۔

اسی سفر میں اکبر سیالکوٹ بھی آیا۔ قلعہ کی عمارت دیکھی۔ امام علی لائق اور دیگر بزرگان دین کے مقبروں اور مزاروں پر گیا۔ اسی زمانہ میں سیالکوٹ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک بزرگ شاہ محمد حمزہ غوث متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کہ عجیب و غریب طبیعت لے کر آیا تھا۔ خود ان سے ملنے گیا۔ ملکر بہت خوش ہوا۔ ان کے خدام اور لنگر عام کے لیے چند گاؤں وقف کر دیئے۔ اکبر نے راجہ مان سنگھ کو سیالکوٹ جاگیر میں دیدیا۔ مان سنگھ نے خوب رعایا پروری سے کام لیا۔ شاہ حمزہ غوث کی حیات میں ان کی عبادت کا چلہ بعمارت پختہ تعمیر کرایا۔ اور جب وہ وفات پا گئے تو ان کے مزار کی تمام عمارت بھی خود بنوائی۔ اس زمانہ میں کشمیر میں شیعہ چک بادشاہ سنی مسلمانوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔

اس لیے کشمیر کے اکثر سنی مسلمان ترک وطن کر کے سیالکوٹ اور دیگر مقامات پر آ گئے تھے۔ اور یہاں عموماً کاغذ سازی کا کام کرتے تھے۔ مان سنگھ نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کاغذ سازوں کو پیشگی روپیہ بطور امداد دیا۔ جس سے انہوں نے اپنے فن کو خوب وسعت و ترقی دی۔ اسی زمانہ میں اسی سرپرستی کی وجہ سے کاغذ کا نام مان سنگھیہ کاغذ مشہور ہو گیا۔

اکبر ہی کے زمانہ میں مولوی کمال الدین کاشمیری استاد مولوی عبدالکلیم اپنے وطن کشمیر سے سیالکوٹ آئے۔ اور میاں وارث کی مسجد میں امام مقرر ہو کر لوگوں کو درس تدریس دینے لگے۔

اکبر کے زمانہ میں تانبہ اور سونے کے سکے اکثر مقامات میں بنائے جاتے تھے۔ تانبہ کی ٹکسال ۱۸ مقامات پر تھی۔ جن میں ایک ٹکسال سیالکوٹ میں بھی تھی۔

سیالکوٹ عہد جہانگیری میں

۱۶۰۵ء لغایت ۱۶۲۲ء

جہانگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کا جاگیردار اور فوجدار (کمانڈنگ افسر) خان خاناں صفدر خاں تھا۔ جس نے قلعہ اور قلعہ کے برجوں کو از سر نو تعمیر کرا کے اس میں قسم کے عجیب و حیرت انگیز محلات تعمیر کرائے کہ چشم فلک نے بھی بہت کم دیکھے ہوں گے۔ ان عمارات میں رنگ محل اور شیش محل نہایت لاجواب عمارتیں تھیں۔ ملازمان جنگی و ملکی کے لئے الگ مکانات تعمیر ہوئے۔ غرض قلعہ بجائے خود ایک اچھا خاصہ شہر تھا۔

صفدر خاں کی تقلید میں رؤسائے شہر نے بھی عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں جہانگیر نے بھی مان سنگھ کی طرح کاغذ سازوں کی سرپرستی کی۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے کاغذ کا نام ”جہانگیری کاغذ“ قرار پایا۔ یہ کاغذ عام کتب کے علاوہ مذہبی کتابوں کی کتابت میں بھی

استعمال ہوتا تھا۔ کاغذ کی پائنداری اور خوشنمائی کی وجہ سے ساہوکار لوگ اپنی بہیاں بھی اسی کاغذ پر بناتے تھے۔ جو کاغذ ادنیٰ یا متوسط درجہ کا ہوتا تھا وہ سرکاری کاغذات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

جہانگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کی آبادی و رونق بہت بڑھ گئی۔ مکانات اور باغات عالیشان تعمیر ہو گئے۔ مرفحہ الحالی میں لوگوں نے خوشدلی کے سامان پیدا کر دیئے۔ علماء و فضلاء کی قدردانی میں جہانگیر نے خاص حصہ لیا۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کو سب سے پہلے جہانگیر نے ہی جاگیر عطا کی تھی۔

سیالکوٹ شاہجہان کے زمانہ میں

۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء مطابق ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ

شاہجہان کے زمانہ میں سیالکوٹ کے آٹھ دروازے تھے۔ اور ہر دروازہ پر چند فوجی سپاہی تعینات تھے۔ دروازوں کے نام معہ ان کے فوجی کمانڈروں کے حسب ذیل ہیں۔ کشمیری دروازہ (بہ ماتحتی سردار کمال خاں لودھی) گجراتی دروازہ (بہ ماتحتی احمد خاں کرانی) مغربی دروازہ (مقصود خاں شروانی) لاہوری دروازہ (یعقوب خاں شروانی) دہلی دروازہ (نصر اللہ خاں شیروانی) مشرقی دروازہ (رحیم خاں ہلوانی) جموں والا دروازہ (بہ ماتحتی زبردست خاں) موری دروازہ (بہ ماتحتی افضل خاں شیروانی) آٹھ دروازوں میں سے چار دروازوں پر صرف شیروانی پٹھانوں کی پہرہ داری اس بات کی علامت ہے کہ یہ لوگ جو ۱۶۳۲ھ میں بچھڑے، بابر مغلوں کے جانی دشمن تھے۔ اور سیالکوٹ کو بابر سے چھیننے کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ ایک سو سال کے بعد ۱۰۳۷ھ میں بچھڑے شاہجہان حکومت پنجاب کی مشین کا ایک قیمتی پرزہ اور سیالکوٹ کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا ایک زبردست

ذریعہ تھے۔ سیالکوٹ میں اب بھی شہروانی پٹھانوں کی ایک معقول تعداد ہے۔ مغلیہ عہد حکومت میں مالکذاری کی رقم شاہی آمدنی کا بہت بڑا بلکہ سب سے زیادہ ذریعہ تھی۔ اکبر سے پہلے جو بادشاہ ہندوستان میں ہوئے ہیں وہ ۶/۱ حصہ پیداوار کا لیا کرتے تھے اور اکبر تیسرا حصہ لیا کرتا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں عام محصولات کی تو خبر نہیں۔ لیکن تاریخ سیالکوٹ یعنی واقعہ زمستان حصار سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے ایام حکومت میں سیالکوٹ میں فی بیگہ صرف چھ پیسے (امر) لگان اراضی تھا! اور باغات کی پیداوار پر تو کسی قسم کا کوئی محصول نہ تھا۔ اس لئے کاشت اراضی۔ باغات اور عمارات دلکش کی تعمیر سے سیالکوٹ بہشت کا ایک ٹکڑہ معلوم ہوتا تھا۔

شاہجہان کے عہد میں مائی پیلاں کے نام سے ایک نیک بخت ہندو عورت سیالکوٹ میں گذری ہے۔ جو بغیر تمیز مذہب و ملت ہر روز تین چار روپے کے پیسے فقراء۔ غرباء اور معصوم لڑکوں میں تقسیم کرتی تھی۔ مائی پیلاں (جہاں آج کل ٹالٹن پارک ہے وہاں اس نیک بخت و مخیر عورت کا ایک باغ بھی تھا۔ جس کے مشرق کی جانب صفدر خاں کے غلام پنوں خاں نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا۔ وہ تالاب تو اب کہیں نہیں۔ البتہ اس مقام کا نام اب تک ”پنوں سر“ مشہور ہے۔) کو ایک دن معلوم ہوا کہ مسجد محلہ خراسیاں جہاں لڑکے پڑھتے ہیں ایسی شکستہ اور خراب حال ہے کہ بارش کے دنوں میں لڑکوں کو قرآن اور سپارے سنمھانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ مائی پیلاں نے مسجد کی مرمت کے لئے پڑا وہ والوں کو کچھ روپے دیئے۔ میاں اسلام یار ایک وڈہرہ رئیس کو جب خبر ہوئی تو اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ میں اس ثواب سے محروم رہوں۔ مائی پیلاں کو بہت کچھ کہا سنا۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مسجد تو میاں اسلام یار بنوائے اور کنواں مائی پیلاں تعمیر کرائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مسجد اور کنواں اب تک محلہ خراسیاں میں آباد ہیں۔

سیالکوٹ عالمگیری عہد میں

۱۶۵۸ء لغایت ۱۷۰۷ء

عالمگیر کے زمانہ میں بھی سیالکوٹ روز بروز رونق حاصل کرتا رہا۔ ملک میں امن و امان تھا۔ تجارت کو کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں مدرسے اور کتب خانے موجود تھے۔ اور علم و ہنر کا ہر جگہ چرچا تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کا ایک صاحب حشمت ہندو وڈہرہ دہلی جا کر مسلمان ہو گیا تھا۔ جس کا نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس کو جاگیر و منصب عطا کر کے سیالکوٹ کا پرگنہ دار مقرر کیا۔ شیخ رحمت اللہ نے کئی عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔ شہر کے عین درمیان بہت اونچی کرسی بنا کر شاہانہ طرز پر ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہی مسجد اب دو دروازہ والی مسجد کہلاتی ہے۔

یہ مسجد محمد فرخ سیر کے زمانہ حکومت میں تکمیل کو پہنچی۔ قطعہ تاریخ مسجد کے دروازہ پر جو سیالکوٹ کے سب سے بڑے بازار میں ہے۔ حسب ذیل درج ہے۔

ہمچو کعبہ شدہ این مسجد بناء
سال تاربخش چو جستم عقل گفت
آسماں گفتہ کہ اہسی ثناء
رحمت اللہ کرد این مسجد بناء

۱۱۵۳۹ھ

۱۲۶۹ھ میں بزمانہ منشی بشارت علی تحصیلدار اعلیٰ پیمانہ پر اس مسجد کی مرمت ہوئی۔ بن باجوہ (ضلع سیالکوٹ) کے ایک عالم باعمل مولوی شیر محمد مرحوم امام مسجد بنائے گئے۔ جن کے فیض تدریس سے اکثر لوگ بہرہ ور ہوئے۔ تاریک مرمت کا قطعہ حسب ذیل ہے۔

چوں بشارت علی نیک نہاد
خواست نادر زسال تاربخش
خانہ کعبہ ساخت نو بنیاد
گفتمش خانہ خدا آباد

۱۲۶۹ھ

اس مسجد کی دوسری مرمت ۱۳۰۶ھ یا اس کے قریب کسی سال میں آغا محمد شہباز خان رئیس سیالکوٹ نے بہ لاگت کثیر کرائی تھی۔

(آغا محمد شہباز خان سیالکوٹ کے ایک نامور رئیس گذرے ہیں۔ ان کی سخاوت و فیاضی سے اہل شہر بہت مستفیض ہوتے تھے۔ ان کا عالیشان مکان جو ریلوے سٹیشن کے متصل راجہ بازار کے کنارہ پر اور دیوار قلعہ کے نیچے ہے اب تک ان کے تمول کا اظہار کر رہا ہے آغا خان باقر خان جنہوں نے ترک موالات کے سلسلہ میں آنریری مجسٹریٹی ترک کر دی۔ اور آغا محمد صفدر خان بی۔ اے جنہوں نے اس سلسلہ میں وکالت ترک کر دی ہے اور جو آج کل محبت وطن ہونے کے جرم میں سزائے قید بھگت رہے ہیں۔ آغا محمد شہباز خان کے ذریعات و باقیات الصالحات میں سے ہیں۔)

عالمگیر کے عہد حکومت میں سیالکوٹ کا علمی شان و شکوہ دار الخلافہ اور عہد مغلیہ کے دوسرے نامور علمی شہروں سے کم نہ تھا علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جن کی تصنیفات ہندوستان سے لے کر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی ہیں کے صاحبزادہ ملا عبداللہ اپنے والد ماجد کی جگہ اپنے مدرسہ کے قائم مقام ہوئے۔ جنہوں نے اپنے علم و فضل کی برکت سے اپنے باپ کے بعد بھی سیالکوٹ کے علمی مرکزیت کے نشان کو مٹنے نہ دیا۔ جیسا کہ صاحب خلاصۃ التاریخ (منشی سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی عہد عالمگیری۔ سنہ تالیف ۱۱۱۸ھ صفحہ ۷۱) مولانا عبداللہ اور ان کے والد مولوی عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں:۔ در عہد خلافت شاہجہان بادشاہ افضل العلماء مظہر طبع مستقیم مولوی عبدالحکیم کہ بحر مواج فضل و کمال و در فضائل و افادات بہمال بود۔ بیشتر مروج علوم گروید و بعضے برکت حاشیہ تصنیف نمودہ محلل معانی مشککہ گروید و طلبہ علم از ممالک دور و نزدیک در مدرسہ متبرکہ ایشاں رسیدہ فیضیاب شدند و بعد رحلت ایشاں

مقتدائے اہل اللہ رہنمائے خلق اللہ مولوی عبداللہ خلف (اس سے معلوم ہوتا ہے مولوی عبدالکلیم کے ایک سے زیادہ فرزند تھے اور مولوی عبداللہ چونکہ دوسرا بیٹا تھا اس لیے ایک ان سے بڑا بھی تھا۔) دویچی آں مغفور رونق افزائے مدرسہ ورہنمائے طلبہ علم اشتعال ورزیدہ فضائل معنوی رابا علوم ثوری ہمدوش و درویشی رابا فضیلت ہم آغوش گردانیدہ۔ از افزونے حسن اخلاق ورہنمائی طبقات خلایق اہل بزرگ را امام وقت گفتند و در ۱۳۶۷ھ عالمگیری بعالم جاویدے شتافتے۔

صاحب خلاصۃ التواریخ نے جو ایک ہندو بزرگ ہیں اور جن کی حیات میں مولوی عبداللہ خلف مولوی عبدالکلیم نے انتقال کیا ہے۔ اور جنہوں نے عالمگیری کی چالیس سالہ حکومت کے دوران میں اپنی تاریخ شروع کی ہے۔ سیالکوٹ کی اس صنعت و حرفت کا ذکر کیا ہے جس نے عہد عالمگیری میں اس کو چار دانگ میں مشہور کر رکھا تھا۔ چنانچہ صاحب خلاصۃ التواریخ سیالکوٹ کے مانسنگھی خلاصہ جہانگیری اور حیریری کاغذوں کا ذکر کرنے کے بعد جن کے متعلق ان کی چشمہ یدرائے ہے کہ وہ سفید و صفا اور دیرپا ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ”کار چکن از ابر لیسیم و کلابتون از قسم باخہ و چہرہ ز فوطہ و سوزنی و عد شقہ دوستار خواں و خوانپوش و راوتی بوٹہ دار و کلابتون موزون مے شود ہر سال قریب لک روپیہ از کار چکن دوزی بہ بیج و شرابے آید و در اطراف گیتی مے رود و نیز جمد ہر دکٹاری و بر چھٹی بہتر مے کنند“

آبادی کے متعلق لکھا ہے۔ ”در زمان سابق دارالحکومت ولایت پنجاب بود و در سہ کروہ آبادی داشت اکنون (یعنی عالمگیری کے چالیسویں سال جلوس یا ۱۶۹۸ھ میں جو تاریخ کی تصنیف کا سال ہے۔) از جمیع قصبات ایں صوبہ در آبادی افزون است۔“

بہادر شاہ شاہ عالم اور سیالکوٹ

عالمگیر اورنگ زیب کے بعد محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ ۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ابتداء میں محمد اعظم اور شاہزادہ کام بخش اور شاہ عالم میں خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ انہی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر سکھ جو کہ ہستانی حصوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑوں سے نکل کر گردنواح میں لوٹ مار کرنے لگے۔ اکثر دیہات اور قصبے ویران ہو گئے۔ مگر سیالکوٹ مغلوں اور پٹھانوں کی زبردست فوجوں اور رعایا کی وفاداری کی وجہ سے بالکل محفوظ رہا۔ بہادر شاہ نے بھائیوں کی خانہ جنگیوں سے فارغ ہو کر اہل سیالکوٹ کی جاگیریں برقرار رکھیں۔ اور ان کے منصبوں میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ بہادر شاہ نے بادشاہ ہو کر اپنی حکومت کا سارا زمانہ قریباً لاہور ہی میں بسر کیا ہے ۱۷۱۲ء مطابق ۱۱۲۹ھ میں اس نے لاہور ہی میں وفات پائی۔ اس کے عہد میں تین بزرگ سیالکوٹ میں بہت مشہور گذرے ہیں (۱) شاہ دن ابدال جن کا مقبرہ عید گاہ کے متصل ہے۔ (۲) شاہ خاکی ولی جن کا مزار رنگپور کے متصل واقع ہے۔ (۳) شاہ مونگا ولی۔ ان کا مقبرہ بھی عید گاہ کے قریب ہی ہے۔ مہاراجہ رنجیب سنگھ کے زمانہ میں ایک سکھ وزیر سنگھ سکھ راجہ گھماؤں تحصیل ڈسکہ نے اپنے حسن اعتقاد سے اس مقبرہ کی عمارت بنوادی تھی۔

فرخ سیر کا عہد اور سیالکوٹ

۱۷۱۲ء میں جبکہ باہمی خانہ جنگیوں اور امرائے دربار کی سازشوں سے سلطنت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ فرخ سیر دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ (عظیم الشان کا بیٹا بہادر شاہ عالم کا پوتا اور اورنگ زیب کا بڑا پوتا تھا ۱۷۱۷ء میں معزول ہو گیا) فرخ سیر کے زمانہ میں بھی سکھوں نے جھاڑیوں اور جنگلوں سے سر باہر نکلا۔ لیکن اس زمانہ میں نواب ذکریا خاں۔

خان بہادرہ اور لاہور کا صوبیدار تھا اس نے ان کی شورش و فتنہ انگیزی سے سیالکوٹ کو محفوظ رکھا اور انتظام کو زیادہ مستحکم اور ہر پرگنہ کو زیادہ محفوظ بنانے کے لئے اس نے سپرو اور ظفر وال کے محال سیالکوٹ سے علیحدہ کر دیئے۔

فرخ سیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کے حسب ذیل چار محال تھے۔ گلکھڑ، سمبڑیاں، مراکیوال، بھاگووال، پرگنہ سیالکوٹ کی کل جمع اس زمانہ میں دس لاکھ ۸۳ ہزار ۲۱ روپیہ تھی۔ ایک لاکھ ۷۸ ہزار کی جاگیر اور معافیات نکال کر نو لاکھ روپیہ سے کچھ زیادہ رقم خالصہ کی تھی۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں سیالکوٹ نو لکھا پرگنہ کہلاتا تھا۔

دیرانہ مزرعہ اور باغات پر کوئی مالیہ نہ تھا۔ اور سڑکانہ اور پٹوار لینے کا بھی اس زمانہ میں کوئی دستور نہ تھا۔

حقیقت رائے کا مشہور واقعہ

فرخ سیر کے زمانہ میں جو واقعہ سب سے زیادہ مشہور اور اہم گذرا ہے وہ سیالکوٹ کے ایک کھتری باغ مل پوری کے نو عمر لڑکے حقیقت رائے کے قتل کا ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ کسی بات پر حقیقت رائے اور ایک مسلمان لڑکے میں جو اس کا ہمدس یا ہم کتب بیان کیا جاتا ہے۔ تکرار ہو گئی۔ گالی گلوچ کے بعد نوبت زدو کوب تک پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقت رائے نے مسلمانوں کے مذہب اور بانئے مذہب کو بھی گالیاں دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ وہ مدرسہ مسجد اور مسجد کے کنوئیں میں نجاست اور گندگی ڈالتا رہتا ہے مقدمہ قائم ہونے پر سیالکوٹ کے محکمہ قضا نے اس پر فرد جرم لگا کر اسے عدالت عالیہ لاہور میں بھجوا دیا۔

حقیقت رائے کے والدین اور دیگر ہندوں بلکہ کئی ایک مسلمانوں نے بھی

حقیقت رائے کے بچانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ نواب خان بہادر ذکریا خاں لاہور کا گورنر تھا۔ اس پر بھی شرفائے لاہور و سیالکوٹ کی سفارشوں کا بڑا اثر ہوا۔ قاضی کو کہا۔ کافی سزا اوسکو مل چکی ہے۔ اگر کوئی صورت اس نا تجربہ کار نو عمر لڑکے کی رہائی کی ہو سکتی ہے تو نکالو۔ لیکن قاضی نے اپنے اختیارات کے سامنے گورنر کی بھی ایک نہ سنی۔ آخر بڑا مہربان ہوا۔ تو یہ کہا۔ اگر حقیقت رائے مسلمان ہو جائے تو بچ سکتا ہے۔

حقیقت رائے گوا بھی بالکل نو عمر تھا۔ لیکن اپنی بے گناہی پر چونکہ اسے کامل یقین تھا اس لئے اس نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا۔ اور آخر قاضی کے فتوے کے مطابق لاہور میں اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔ اور لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی۔

حقیقت رائے کے قتل پر ہندوؤں نے بڑا ماتم کیا۔ اس کی سادھ دو جگہ بنی۔ لاہور اور سیالکوٹ۔ دونوں جگہ حقیقت رائے کی سادھ پر بہت بڑا میلہ ہوتا ہے لاہور میں بسنت کا مشہور بارونق میلہ اسی سادھ پر جو موضع چاہ میراں اور بھوگیوال کے درمیان ہے۔ ہوتا ہے۔ لوگ پتنگ بازی کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بعض ٹولیاں بھجن بھی گاتی ہیں۔ اور سادھ کے متصل حقیقت رائے کے استقلال اور اس کی ثابت قدمی و حریت پر لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ اس میلہ میں عورتیں بھی بکثرت ہوتی ہیں۔

سیالکوٹ کی جس مسجد میں حقیقت رائے پڑھا کرتا تھا۔ وہ مسجد اب تک محلہ ہیجڑاں میں موجود و آباد ہے۔

حقیقت رائے کے متعلق ہندو شاعروں نے بہت سے دردناک قصے لکھے ہیں۔ اور اس کے ایثار کی تعریف کر کے اس کو حقیقت رائے دھری کا خطاب دیا ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ اور سیالکوٹ

۱۷۲۰ء..... تا..... ۱۷۴۸ء

محمد شاہ روشن اختر کی حکومت کو نادر شاہی آفت کے بعد جس دوسری مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کا (۱۷۴۷ء کا) حملہ تھا۔ جس میں گواحد شاہ ابدالی کو اس کے ہمنام شہزادہ احمد شاہ تیموری بن محمد شاہ نے بمقام سرہند کامل شکست دی۔ مگر ابدالی کا کابل اور تیموری کے دہلی واپس جانے کے بعد سکھوں کے دل سے مغلیہ حکومت کا رہا سہا رعب بھی جاتا رہا۔ اور وہ پھر جنگوں سے نکل کر لاہور اور سیالکوٹ پر حملے کرنے لگے۔ اس زمانہ میں وزیر قمر الدین خان کا بیٹا نواب معین الملک لاہور کا حاکم تھا۔ اور سیالکوٹ بھی اسی کے ماتحت تھا۔

جس طرح آجکل سرحدی لوگ بنوں۔ کوہاٹ۔ تھل وغیرہ سرحدی مقامات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جبرا پکڑ کر لیجاتے ہیں۔ اور پھر ان کے وارثوں سے زرفدیہ طلب کر کے ان کو واپس کرتے ہیں۔ یا کئی کئی وحشی خونخوار سرحدی پٹھان جمع ہو کر کسی سرحدی گاؤں میں دفعۃً چھاپہ مارتے اور گاؤں کے گاؤں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانہ میں خونخوار سکھ ڈاکے اور چھاپے مارتے اور خلق خدا کو بیکار تکلیف دیتے تھے۔ سیالکوٹ کے لوگ شام ہی سے دروازہ بند کر لیتے تھے۔ اور شہر کے دروازے بھی سر شام ہی ماسوائے محلہ موری دروازہ کے جو تمام رات کھلا رہتا تھا (موری دروازے کا حاکم شہر کا حاکم ہوتا تھا) بند ہو جاتے تھے۔ مگر پھر بھی کئی اکے دے سکھوں کے قابو آ جاتے تھے۔

احمد شاہ اور سیالکوٹ

۱۷۲۸ء..... تا..... ۱۷۵۲ء

محمد شاہ رنگیلے کے بیٹے احمد شاہ کی سلطنت اور معین الملک کی نظامت لاہور کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی پھر ایک مرتبہ خونخوار لشکر لے کر کابل سے نکلا۔ جب احمد شاہ دریائے اٹک کو عبور کر چکا۔ تو اس نے بادشاہ کو دہلی لکھا۔ اور مدد طلب کی۔ لیکن وہاں صدائے برنخاست کا معاملہ تھا۔ آخر جب ابدالی لشکر لاہور کے کنارہ آ پہنچا۔ تو معین الملک نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر صلح کے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ آخر ضلع اس شرط پر ہوئی کہ گورنر لاہور۔ سیالکوٹ۔ گجرات۔ پسرور وغیرہ پر گنوں کی آمدنی ہر سال کابل پہنچایا کرے۔ معین الملک نے یہ شرط منظور کر کے ابدالی سے اپنی جان تو چھڑالی۔ مگر ۱۷۵۲ء سے سیالکوٹ کی آمدنی صوبہ لاہور کی معرفت کابل جانے لگی۔

احمد شاہ کابلی کے ماتحت سیالکوٹ کی حالت

سیالکوٹ جو ۱۷۲۵ء سے تیموری خاندان کے ماتحت چلا آتا تھا۔ ۱۷۵۲ء میں یعنی کامل دو سو ستائیس سال کے بعد کابل کے درانی خاندانی میں انتظامانہ سہی لیکن مالی طور پر ضرور منتقل ہو گیا۔

شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا کہ سکھ اور مرہٹے پنجاب کو پامال کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے۔ اسی اثناء میں احمد شاہ ابدالی پھر پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ اور اس مرتبہ وہ ایک اپنا گورنر خواجہ عبید خاں لاہور میں مقرر کر گیا۔ کابل جا کر اس نے عبید خاں کے پاس سات ہزار افغانوں کی ایک جمعیت بسر کردگی سردار نور الدین خاں سکھوں کے استیصال کے لئے روانہ کی۔

ابھی نورالدین گوجرانوالہ ہی میں تھا کہ ۱۷۶۳ء مطابق ۱۸۲۰ء بکرمی میں چڑت (دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ۔) سنگھ سکر چکیہ وغیرہ سرداروں نے معہ جسا سنگھ اہلووالیہ (بائے ریاست کپورتھلہ۔) اس کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بہت سے کشت و خون کے بعد نورالدین خاں کو شکست ہوئی اور وہ میدان سے بھاگ کر سیالکوٹ کے قلعہ میں کہ نہایت مستحکم و مضبوط تھا۔ پناہ گزین ہو گیا۔ سکھوں نے قلعہ کا محاصرہ کر کے رسد چاروں طرف سے بند کر دی اہل شہر پر یہ دن بڑی مصیبت کے تھے۔ ان پر اکثر حملے ہوتے تھے۔ اور وہ لوٹ لئے جاتے تھے۔ کئی دنوں کے بعد جب اہل قلعہ کی رسد ختم ہو گئی۔ تو نورالدین خاں موقع پا کر جموں کے راجہ کے پاس چلا گیا۔ جو اس سے بڑی عزت کیساتھ پیش آیا۔

خواجہ عبید خاں گورنر لاہور نے یہ غلطی کی کہ سکھوں پر اعتبار کر کے ان کو فوج میں بھرتی کر لیا۔ اور ایک فوج لیکر جس میں سکھوں کی بھی معقول تعداد تھی۔ نورالدین خاں کی مدد کے لئے سیالکوٹ روانہ ہوا۔ ابھی گوجرانوالہ تک ہی پہنچا تھا کہ سکھوں کی فوج جو سیالکوٹ پر ظفریاب ہو کر لاہور پر حملہ آور ہونے کے لیے واپس آرہی تھی۔ عبید خاں کو ملی۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ ابھی لڑائی شروع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ کہ اس کی فوج کی کثیر تعداد بوجہ ہم مذہبی سکھوں سے جا ملی۔ اور عبید خاں کو ان بد عہدوں کی دغا بازی (تاریخ پنجاب صفحہ ۸۴۔ مصنفہ رائے بہادر کنہیا لعل لاہور) سے شکست کھانی پڑی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب پر شاہانِ دہلی کا کوئی اثر نہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے عبید خاں کی جگہ دیوانِ کابلی کو جو پہلے نائب گورنر تھا۔ لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ کابلی مل کے زمانہ میں سکھوں کا پھر زور ہو گیا۔ اور ان کے مجبور کرنے بلکہ ان کی علانیہ دھمکیوں سے خوف کھا کر دیوان نے قصابانِ گاوکش کے ناک کان کاٹ دیئے۔ احمد شاہ نے دیوان کی یہ بزدلی سن کر کابل سے دلاور خاں نام ایک افغان کو لاہور کا صوبہ دار بنا کر بھیجا۔ اور کابلی مل کو اس کا

نائب مقرر کیا۔ کابلی مل نے بظاہر تو کوئی چون چرانہ کی۔ مگر دل میں بہت برا منایا۔ اور اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ سکھوں سے مل کر ان کو صلاح دی کہ بادشاہ کے مقرب و مصاحب جہان خان پر حملہ کرو۔ جو تمہارے تباہ کرنے کی فکر میں دس ہزار سوار لئے قلعہ رہتاس میں موجود ہے۔ جب سکھ دیوان کا اشارہ پا کر جہان خان پر حملہ آور ہوئے تو وہ سیالکوٹ میں مقیم تھا۔ سکھ بھی سیالکوٹ پہنچے۔ صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ اہل شہر توپوں کی گرج اور تلواروں کی چمک سے لرزان و ترساں رہے۔ جہان خان شکست کھا کر رہتاس بھاگ گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۳ء کا ہے۔ (اسی واقعہ کے متعلق تاریخ کپورتھلہ میں صفحہ ۲۰۹ پر مندرجہ ذیل سطور درج ہیں۔ ۱۸۲۱ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں سرداران مثل بھنگی (سانون سنگھ۔ گنڈا سنگھ۔ جھنڈا سنگھ۔ ہری سنگھ اہلووالیہ۔ ناہر سنگھ چماری والہ) سرداران مثل گھنیاں (بے سنگھ۔ حقیقت سنگھ۔ امر سنگھ گھنیا امیر سنگھ کنگرہ) ۲۵ ہزار سکھوں کی جمعیت لیکر مہاراجہ جاسا سنگھ کپورتھیلہ کیساتھ سیالکوٹ پر حملہ آور ہوئے۔ موضع مسکن پنڈ میں جو سیالکوٹ سے بفاصلہ پانچ کوس دور ہے سردار جہان خان اپنی فوج لئے مقیم تھے۔ بہت سے کشت و خون کے بعد جہان خان ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کہیں غایب ہو گیا۔ مہاراجہ جاسا سنگھ نے سردار کے قبائل کو ان کی مرضی کے مطابق جموں بھجوا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار کی بیگم اور جموں کی رانی کا آپس میں بہنا پاتا تھا۔) اس زمانہ میں سیالکوٹ کی حکومت جیون خاں پٹھان کے سپرد تھی۔

سکھوں کے جن سرداروں نے سیالکوٹ پر حملہ کر کے جہان خان کو شکست دی۔ اور جیون خاں کو حکومت سے بے دخل کیا تھا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ ہری سنگھ۔ ساون سنگھ۔ گنڈا سنگھ۔ جھنڈا سنگھ۔ ان سب سرداروں کا تعلق سکھوں کی بھنگی مثل سے تھا۔ (تاریخ بندوبست سیالکوٹ صفحہ نمبر ۳)

ان سب سرداروں نے بالاتفاق سردار جیت سنگھ کو سیالکوٹ کا حاکم مقرر کیا۔

رنجیت سنگھ کی فوج کشی سیالکوٹ پر

۱۸۰۷ء

رنجیت سنگھ شاہ زمان کی خوشنودیے مزاج (جب ۱۷۸۸ء میں کابل کو واپس جاتے ہوئے شاہ زبان والے کابل کی چند توپیں دریائے چناب سے پار نہ ہو سکیں تو اس نے رنجیت سنگھ کو جوان دنوں رسولنگر کا مالک و مختار تھا۔ اور جس کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی یہ حکم دیا تھا کہ اگر تم ہماری توپیں دریا سے نکلوا کر ہمارے پاس کابل میں پہنچا دو گے تو حکومت لاہور کی سند تمہارے نام کر دی جائے گی۔ بقول حافظ شیرازی اگر آن ترک شیرازی بدست آ رودل مارا۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را۔ رنجیت سنگھ نے توپیں نکلوا کر شاہ زمان کے بھیج دیں۔ اور حکومت لاہور گھر بیٹھے لے لی جو حکومت پنجاب کا پیش خیمہ تھی۔ رعایائے لاہور بھی سے حاکمان لاہور کے ظلم و ستم سے تنگ تھی۔ اس نے بھی اپنے قائم مقاموں کے ذریعہ رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔) اور رعایائے لاہور کے ایما کے بعد جب ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قابض ہو گیا۔ تو چند ہی دنوں میں اس نے جسروٹہ۔ چمبہ کے علاوہ کئی اور رؤساء اور راجے مطیع کر لئے۔ مگر ابھی تک دوسرواروں کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ایک جیون سنگھ سردار بھنگی جو جیت سنگھ کے بعد سیالکوٹ پر حکمران تھا۔ دوسرے صاحب سنگھ بھنگی جس کی حکومت دریائے چناب سے پار گجرات کے علاقہ میں تھے۔ رنجیت سنگھ نے پہلے جیون سنگھ کی موت کا انتظام سوچا۔ ایک جرار فوج لے کر جب سیالکوٹ کے نزدیک پہنچا تو اپنے وکیل کے ہاتھ اسے یہ پیغام بھیجا کہ اگر مال و جان کی سلامتی مطلوب ہے۔ تو اطاعت نامہ لکھ دو۔ اور ہالانہ نذرانہ مقرر کر دو۔ ورنہ جنگ کے بعد کوئی عذر سماعت نہ ہوگا جیون سنگھ کو سامان جنگ اور قلعہ کے استحکام پر تکبر اور گھمنڈ تھا۔ مگر

رنجیت سنگھ کے عروج و اقبال سے غافل تھا۔ اس کے وکیل کو جواب دیا، ہمیں میدان ہمیں چوگاں ہمیں گوا!

رنجیت سنگھ کو جب یہ جواب ملا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور قلعہ کی بیرونی آبادی پر اس قدر سختی کی کہ روپیہ پیسہ تو کجا۔ ان کا کپڑا اور زیور تک بھی نہ چھوڑا۔ ہندو مسلمان کوئی بھی رنجیت سنگھ کے اس ظلم سے نہ بچ سکا۔ سکھ وحشیوں کی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے۔ اور گھر کا اسباب تہ و بالا کر کے اور گھر والوں کو مار پیٹ کر جو کچھ ملتا تھا لے آتے تھے۔

جیون سنگھ نے قلعہ کا یہ انتظام کیا کہ ایک ہزار مسلح سکھ قلعہ کی دیواروں پر بٹھا دیئے جو رنجیت سنگھ کے آدمیوں کی خبر رکھتے۔ اور دور ہی سے ان کو تاک کر نشانہ لگاتے تھے۔ چار توپیں اس کے پاس تھیں۔ وہ اس نے قلعہ کی چاروں دیواروں پر نصب کرادیں۔ شہر والوں کو قلعہ والوں کی خبر نہ تھی۔ اور قلعہ والے شہر والوں کے حال سے بے خبر تھے۔

جیون سنگھ کی فوج ایک دو مرتبہ قلعہ سے باہر نکلی مگر بہت سا نقصان اٹھا کر واپس آ گئی۔ اس وقت اہل شہر کی جو حالت تھی۔ اس کی کچھ کیفیت ذیل کے الفاظ سے معلوم ہو سکے گی۔ سکھوں نے شہر کی خوب خبر لی۔ اور ایسا لوٹا کہ نان شبینہ کا محتاج کر دیا۔ (تاریخ پنجاب۔ رائے بہادر کنھیالعل۔ صفحہ نمبر ۱۹۳۔) بعد ازاں کامل تین دن تک قلعہ کا محاصرہ رہا۔ اہل قلعہ نے مہاراجہ کی فوج کے بیٹھا گھوڑے تلف کئے۔ اور کئی آدمی بھی جان سے مار دیئے۔ چوتھے دن مہاراجہ نے یہ تجویز کی کہ دو توپیں قلعہ کے دروازہ پر نصب کر کے دروازہ کو توڑ دیا جائے مگر اہل قلعہ بھی ایسے جوانمرد تھے کہ اندر سے پے درپے گولے برسائے تھے۔ اور توپوں کو دروازہ تک نہیں آنے دیتے تھے۔

رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ گھوڑوں اور بیلوں کی جگہ توپوں کے آگے سکھوں کو جوتا

جائے۔ چنانچہ ایک ایک توپ کے آگے سینکڑوں سکھ حیوانوں کی طرح لگائے گئے۔ جو مرتے کٹتے قلعہ کے دروازہ تک توپیں لے ہی گئے۔ توپوں کا وہاں پہنچنا ہی تھا کہ گولہ باری شروع ہو گئی۔ رنجیت سنگھ قلعہ کا دروازہ توڑنے میں آخر کامیاب ہو گیا۔

جیون سنگھ قلعہ کے اندر محصور تھا۔ وہ بچ کر کہاں جاسکتا تھا۔ اس کی گرفتاری فوراً عمل میں آئی۔ اس کا خزانہ اور اسلحہ کا ذخیرہ اور بارود کا سامان سب ضبطی میں آ گئے۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے شہر میں منادی کرادی کہ لوگ بے اندیشہ گھروں میں آباد اور اپنے اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ لیکن اتنی لوٹ مار اور اس قدر تباہی و بربادی کے بعد لوگ زبان حال سے یہ کہتے تھے اب کیا رہا ہے جس پر رقبیوں کا ڈر کریں۔

غرض ۱۸۰۱ء میں سنگھ ان بھنگی کی حکومت کا سیالکوٹ میں خاتمہ ہوا۔ رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ کی کاررداری حکما سنگھ چمپنی کے سپرد کی۔

رنجیت سنگھ کا جشن سیالکوٹ میں

سیالکوٹ کے بعد گجرات اور گجرات کے بعد کئی اور شہر رنجیت سنگھ کے قبضے میں آتے گئے۔ اٹک کا قلعہ کہ قبضہ پشاور کی کنجی تھی۔ وہ بھی انہی ایام میں فتح ہو گیا۔ رنجیت سنگھ آپ تو ان فتوحات کے شکرانہ و نذرانہ کے لئے جو الاکھی روانہ ہوا۔ اور کھڑک سنگھ اپنے ولی عہد کو حکم دیا کہ وہ فوج سمیت سیالکوٹ جائے اور ہمارے آنے کا منتظر رہے۔ کھڑک سنگھ لاؤ لشکر سمیت سیالکوٹ آ گیا۔ شہر میں چاروں طرف سکھ ہی سکھ نظر آتے تھے۔ ہر چند رنجیت سنگھ نے امن و امان کی منادی کرادی تھی مگر لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر خود بخود سہمے جاتے تھے۔ جب رنجیت سنگھ جو الاکھی کے مندر سے واپس سیالکوٹ آیا تو اس نے آتے ہی تمام راجگان کو ہستانی اور جاگیر داران ملک کے نام احکام صادر کئے۔ کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے

کرنی الفورسیا لکوٹ میں حاضر ہوں۔ رنجیت سنگھ کا رعب داب اس وقت تمام پنجاب پر چھایا ہوا تھا۔ کسی کوسرتابی کی طاقت نہ تھی۔ سب راجے۔ رئیس۔ جاگیردار حاضر ہو گئے۔ سیالکوٹ فوجوں کی کثرت سے اچھا خاصہ میدان جنگ معلوم ہوتا تھا۔ کئی دنوں تک جشن ہوتے رہے۔ اور عیش و نشاط کا بازار گرم رہا۔ رنجیت سنگھ کا اس اجتماع عظیم سے مطلب صرف یہ تھا۔ کہ لوگوں پر اس کی ہیبت چھا جائے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد سب راجے اور رئیس رخصت کر دیئے گئے اور رنجیت سنگھ بھی اپنی فوجیں لے کر اور تو پخانہ اونٹوں پر لدوا کر سیالکوٹ سے وزیر آباد اور وہاں سے رہتاس کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ شجاع والے کابل سیالکوٹ میں

شاہ شجاع جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا اور اسی شاہ زبان کا بھائی تھا جس نے چند توپوں کے معاوضہ میں رنجیت سنگھ کو پنجاب کا فرمانروا بنا دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں تخت کابل پر بیٹھا۔ ۱۸۱۲ء میں اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ وہ اس توقع پر رنجیت سنگھ کے پاس چلا آیا کہ آخر ہمارے خاندان کا احسان مند ہے۔ خاطر داری سے پیش آئے گا۔ اور اگر احسان بھی اس کو یاد نہ ہو تو آخر پنجاب کا بادشاہ ہے۔ وہی سلوک مجھ سے کرے گا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔

رنجیت سنگھ نے چند دنوں تک تو خاطر داری کی۔ لاہور کی مشہور مبارک حویلی (اسی مبارک حویلی میں نواب سرفتح علی خاں قریب باش رئیس، جاگیردار لاہور کا قیام تھا۔ یہ حویلی موجید روازہ کے اندر متصل چوک نواب صاحب واقع ہے۔) شاہ شجاع کی اقامت گاہ بنی۔ جب رنجیت سنگھ کو معلوم ہوا۔ کہ گوہ نور ہیرا شاہ کے پاس ہے تو اس نے اس کے لینے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ اپنے وزراء امراء اس کے پاس بھیجے۔ وہ بھی ناکام

آئے۔ تو تین دن تک اناج کا ایک دانہ بھی اندر جانے کی ممانعت کر دی اور سخت پہرے لگا دیئے۔ جب بادشاہ اور اس کی بیگمات بھوک سے ہلاک ہونے لگے۔ تو اس شرط پر کوہ نور دیا جانا منظور ہوا کہ رنجیت سنگھ خود بادشاہ کے پاس آئے۔ اور ہیرا طلب کرے۔ رنجیت سنگھ نے ایسا ہی کیا۔ اور ہیرا لے لیا۔ یہ واقعہ یکم جون ۱۸۱۳ء کا ہے۔ شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ رنجیت سنگھ بادشاہ نہیں بلکہ ایک ڈاکو اور حریص اور رهنزن ہے۔ تو مزید بے عزتی کے خوف سے رات ہی رات حویلی سے نکل کر ایک چھکڑے کے ذریعہ گوجرانوالہ پہنچا۔ اور وہاں سے سیالکوٹ چلا آیا۔

ہر چند بھیس بدلے ہوئے تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے مخبر ہر جگہ تھے۔ اور سیالکوٹ تو خود رنجیت سنگھ کی مملکت میں تھا۔ اور شاہ شجاع کے فرار ہونے کی خبریں بھی تمام ملک میں پھیل چکی تھیں۔ اس لئے چند دن تو اس نے بری بھلی طرح یہاں بسر کئے۔ لیکن جب اطمینان کی کوئی صورت نہ دیکھی تو سیالکوٹ سے جموں اور وہاں سے کشتواڑ چلا گیا۔

سیالکوٹ شہزادہ کشمیر سنگھ و پشوارا سنگھ کی جاگیر میں

رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ کا پرگنہ اپنے دو بیٹوں کشمیر سنگھ و پشوارا سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تھا۔ دونوں بھائی ایک ہی ماں کے لطن سے تھے۔ اور اتفاق و محبت سے سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ جب ۱۸۲۲ء میں (رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد) بزمانہ مہاراجہ ولیپ سنگھ راجہ ہیرا سنگھ وزیر ہو گیا۔ تو اس کے چچا راجہ سوچیت سنگھ کو یہ امر سخت ناگوار گزرا۔ کیونکہ وزارت کا وہ خود مدعی تھا۔ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے اپنے بھتیجے راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کو نا کام و بدنام کرنے کے لئے ملک فتح خاں ٹوانہ سے ملکر ڈیرہ اسماعیل خاں۔ ملتان اور سیالکوٹ میں شورش پیدا کرادی بلکہ کنور کشمیر سنگھ و پشوارا سنگھ کو سلطنت و حکومت کی امیدیں بھی دلائیں۔

سیالکوٹ میں بے شمار نئے لوگ بھرتی ہو گئے۔ سکھوں کی چار جہنمیں لاہور سے پشاور کو جا رہی تھیں۔ جب وزیر آباد پہنچیں اور ان کو معلوم ہوا کہ کنور کشمیر سنگھ جو تنخواہ اپنی نئی فوج کو دے رہا ہے وہ دربار لاہور کی تنخواہوں سے زیادہ ہے۔ تو چاروں جہنمیں اضافہ تنخواہ کے طمع پر پشاور جانے کی بجائے سیالکوٹ چلی گئیں۔

یہ حال دیکھ کر دربار لاہور کو فکر و اندیشہ ہوئی۔ راجہ گلاب سنگھ ان دنوں اپنی ریاست (جموں) میں تھا۔ دربار لاہور کے حکم سے وہ مفسدوں کی سرکوبی کے لئے لشکر اور خزانہ لے کر سیالکوٹ آیا۔ ایک دو معمولی لڑائیوں کے بعد مفسد منتشر ہو گئے۔ اور کشمیر سنگھ و پشور سنگھ کو اس لیے کچھ نہ کہا۔ کہ مہاراجہ کے فرزند ہونے کی وجہ سے سکھ ان کا بڑا ادب کیا کرتے تھے۔

کشمیر سنگھ تو چند دنوں کے بعد اس لڑائی میں مارا گیا۔ جو اس نے عطر سنگھ سندھانوالیہ اور بھائی پیر سنگھ (آنرے ستلج) کے ساتھ شامل ہو کر راجہ ہیر سنگھ کی فوج کے ساتھ کی تھی۔ باقی پشور سنگھ رہ گیا۔ جو ہر سنگھ برادر رانی جنداں اس سے بہت جلتا تھا۔ اس کے ایماء سے دربار لاہور نے اسے جواب طلبی کے لیے لاہور بلوایا۔ لیکن ساتھ ہی فوج خالصہ کی طرف سے یہ پیغام بھی پشور سنگھ کو ملا۔ کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ جب پشور سنگھ لاہور آیا۔ تو فوج نے دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا۔ سرداران فوج نے بدھو کے آواپ اس کو مہاراجہ پنجاب تسلیم کر لیا۔ یہ حال دیکھ رانی جنداں اور اس کا بھائی جو ہر سنگھ بہت گھبرائے۔ فوج کو قابو میں رکھنے کا صرف ایک ہی علاج تھا۔ کہ روپیہ بے دریغ خرچ کیا جائے۔ راجہ جو ہر سنگھ نے فوج کے ہر سپاہی کو ۲۵-۲۵ روپے کا طلائی کٹھہ دینے کا وعدہ کیا۔ فوج بندہ زر تھی۔ پشور سنگھ کو چھوڑ کر جو ہر سنگھ کے ساتھ ہو گئی۔ پشور سنگھ اپنا سامنہ لیکر سیالکوٹ چلا آیا۔ اور وہاں سے اٹک جا کر قلعہ اٹک پر قبضہ کر کے امیر دوست محمد خاں والے کابل سے خط و کتابت کرنے لگا۔ جو ہر سنگھ نے پشور سنگھ کے

استیصال کے لئے فوج عظیم روانہ کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر چتر سنگھ اٹاری والہ اور فتح خاں ٹوانہ نے کہ دونوں دربار لاہور کی فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ مکر و فریب کا جال پھیلا کر صلح کے بہانے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور واپسی کے وقت راجہ جواہر سنگھ کے ایماء کے مطابق ایک رات کو اسے قتل کر دیا۔ اور لاش اس کی دریائے اٹک میں پھینک دی! یہ واقعہ اواخر ۱۸۴۵ء کا ہے۔

غدر کے ۱۸۵ء کا سیالکوٹ

سکھ افواج کی خود سری و جہالت اور وزراء و امرائے دربار کی خود غرضیوں اور خانہ جنگیوں نے بہت جلد سکھ حکومت کا پنجاب سے خاتمہ کر دیا۔ اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب مستقل طور پر برٹش گورنمنٹ کے ماتحت آ گیا۔

لوگ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ رعایا شاد و آباد تھی۔ کہ دفعہ ہندوستان میں غدر نمودار ہو گیا۔ غدر و شورش کا زیادہ زور یو۔ پی اور دہلی و میرٹھ کی طرف تھا۔ پنجاب نسبتاً اس کے اثر سے بہت کچھ بچا۔ مگر پھر بھی کئی مقامات پر کم و بیش فساد اور خون ہوتے رہے۔ سیالکوٹ میں بھی ہندوستانی افواج نے ۹ جولائی ۱۸۵ء کو بغاوت کی۔ اس وقت موٹگن صاحب ڈپٹی کمشنر میکمان اسٹینٹ کمشنر اور جون صاحب اور سید قائم علی اکسرا اسٹنٹان ضلع کے افسر تھے۔ انگریز چھاؤنی میں رہتے تھے۔ ہندوستانی سواروں نے بریگیڈیر افسر کے علاوہ کئی اور انگریز اور میم اور بچے قتل کر دیئے۔ کچھ راجہ تيجا سنگھ کی قلعہ نما حویلی میں جا چھپے۔ بعض بھاگ کر قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر موٹگن بچا رہا۔ تھو۔ وہ خدا جانے کن مشکلوں سے قریب کے ایک گاؤں کی خس پوش جھونپڑی میں جا چھپا۔ غرض امن پسند طبقہ کی خیر خواہی کی بدولت اکثر انگریزوں کی جانیں تونچ گئیں۔ مگر مفسدوں نے جیل خانہ کے سب قیدی رہا کر دیئے۔ خزانہ لوٹ لیا۔ ضلع کا دفتر اور دوسرے تمام محکمے

اور کچھریاں اور میگزین وغیرہ آگ لگا کر اڑا دیئے گئے۔ پولیس کے پیادہ اور سواروں نے امن قائم رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ لفٹنٹ منگمری اس وقت رسالہ نمبر ۹ میں تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور پہنچے اور وہاں سے مدد لائے۔

جب کچھ امن ہوا۔ اور تحقیقاتیں شروع ہوئیں تو سیالکوٹ کے دو بڑے ہندوستانی افسروں کو سولی پر چڑھایا گیا۔ بڑے بڑے مفسد گرفتار ہو کر قابل دار قرار پائے۔ ۱۳۹ مفسد جموں کی سرحد سے پکڑے آئے۔ وہ توپ سے اڑا دیئے گئے غرض انتظام جدید میں کپتان کرب ڈپٹی کمشنر اور لارنس صاحب افسر پولیس مقرر ہوئے۔ اور از سر نو امن و امان قائم ہوا۔ اس مفسدہ کی وجہ سے شہر باشوں پر پچاس ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ مگر جب حکام کو معلوم ہوا کہ شہر والے خیر خواہ رہے ہیں اور ان کی مدد و سعی سے اکثر انگریزوں کی جانیں بچی ہیں تو جرمانہ معاف کر دیا گیا۔ اسی جرمانہ کی رقم سے مولوی عبدالحکیم کے تالاب کی صفائی اور مرمت کی گئی۔



کتاب ملنے کے پتے

عمر برادرز چوک پرانی غلہ منڈی حاجی پورہ روڈ سیالکوٹ

فون 052:3551158 0300:6139596:0323:6139596

مولانا محمد خالد رضوی موبائل 0321:7130294

جامع مسجد حضرت علامہ عبدالکلیم رحمۃ اللہ علیہ تحصیل بازار سیالکوٹ

موبائل 0322:4002392:0308:4002392

قادری کتب خانہ 90 سیٹھی پلازہ سیالکوٹ فون 052:4591008